جاری کردہ

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

# ترجمان القرآن

۱۹۹۴

مُدیر : خرّم مُراد

اِدارۂ ترجمان القرآن

ماہنامہ

# ترجمان القرآن

مدیر: خرم مراد

عدد ۱۰ | اکتوبر ۱۹۹۴ ربیع الثانی ۱۴۱۵ | جلد ۱۲۰

## فہرست مضامین

**برائے ادارتی امور**

منصورہ ملتان روڈ لاہور 54570 فون نمبر ۸ - ۷۵۷۰۱۲۴ فیکس (۰۴۲) ۷۵۷۴۷۱۹

**برائے انتظامی امور**

رحمن مارکیٹ اردو بازار لاہور ۵۴۰۰۰ فون نمبر ۷۲۳۴۰۱۴ - ۷۲۳۶۶۶۵
پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳

زر سالانہ بذریعہ منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ترجمان القرآن لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔ کراس چیک قبول نہیں کیے جائیں گے۔

**قیمت فی شمارہ -/۱۰ روپے، زر سالانہ -/۱۰۰ روپے (اندرون ملک)**

عرب ممالک، خلیجی امارات و برعظیم -/۵۰۰ روپے، یورپ -/۶۰۰ روپے، امریکا و آسٹریلیا: -/۷۰۰ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ملک عید پرنٹرز لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

**ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ اچھرہ لاہور (پاکستان)**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# اشارات

## خرم مراد

جماعتِ اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلس شوریٰ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۱۸ - ۲۲ اگست میں اپنی مستقبل کی حکمتِ عملی کے بنیادی خطوط کے بارہ میں جو اہم قرارداد منظور کی ہے' ہمارے نزدیک اس کے چار نکات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں:

ایک : عوام کی دینی تعلیم و تربیت کی ملک گیر مہم۔

دوسرے : قوم کو جذبہ جہاد سے سرشار کرنا' اور جہاد کشمیر کی امداد و حمایت کے لیے متحرک و متحد کرنا۔

تیسرے : نوجوانوں اور خواتین کو خصوصی طور پر دعوتِ اسلامی' اصلاحِ معاشرہ اور اقامتِ دین کے لیے منظم و متحرک کرنا۔

چوتھے : خیر' جہاں بھی ہو اور جتنا بھی لوگوں میں پایا جاتا ہو' اسے ایک پلیٹ فارم پر مجتمع اور منظم کرنا۔

ان میں سے کوئی نکتہ بھی بالکل نیا نہیں' لیکن ظاہر ہے کہ صرف پرانی باتوں کو دہرا دینا مقصود نہیں ہو سکتا۔ جس توجہ اور محنت سے' جس انداز میں' جن معنوں میں' اور جن تدابیر کے ذریعہ اب یہ کام کرنا چاہیں' اسی کی بنا پر انھیں قرارداد میں شامل کیا گیا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ آج کے دَور میں ان نکات کے مفہوم و مطلوب اور تقاضوں کو اچھی طرح سمجھا جائے' اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پورے جوش و جذبہ' انتھک محنت اور بڑی حکمت کے ساتھ تمام موزوں اور ممکن تدابیر اختیار کی جائیں۔

------------ ---------

عام مسلمانوں کی دینی تعلیم و تربیت آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت اور تحریکِ اسلامی

کے لیے بہت بڑا چیلنج ہے۔ اقامتِ دین کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ سیرت و کردار اور صلاحیتوں کے لحاظ سے مطلوب معیار کے جاں نثاروں اور سرفروشوں کا ایک منظم گروہ موجود ہو، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ عوام میں ایمان، نیکی اور جہاد کی روح غالب اور کار فرما ہو۔

جماعتِ اسلامی کے مستقل لائحۂ عمل کے تیسرے جزو --- اجتماعی اصلاح کی سعی --- کا دائرہ اگرچہ معاشرہ کی ہمہ گیر اصلاح پر محیط ہے، مگر اس کی روح، بنیاد اور غالب حصہ عوام کی دینی اور اخلاقی تعلیم و تربیت ہی پر مشتمل ہے۔ اسی تعلیم و تربیت کی بنیاد پر معاشرہ کی ہمہ گیر اصلاح کی عمارت اٹھ سکتی ہے، اور یہ بات سیّد مودودیؒ نے بالکل واضح کردی تھی کہ معاشرہ کی اصلاح، نظامِ صالح کا قیام، نفاذِ شریعت اور زمامِ کار کی تبدیلی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ "معاشرہ کی اصلاح و تعمیر کے لیے اپنی کوششوں کا دائرہ اتنا ہی بڑھاتے چلے جائیں جتنا آپ کی طاقت بڑھے، تاکہ معاشرہ اس نظامِ صالح کو لانے اور سہارنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تیار ہوتا جائے جسے آپ لانا چاہتے ہیں (تحریک اسلامی کا آیندہ لائحۂ عمل، ص ۱۹۹)۔ "ایک صالح قیادت اسی طرح بروئے کار لائی جاسکتی ہے کہ ہم اپنے لائحۂ عمل کے چاروں اجزا پر بیک وقت کام کریں، اور توازن کے ساتھ ان چاروں گوشوں میں کام کرتے ہوئے اس طرح آگے بڑھیں کہ افکار کی تعمیرو تطہیر، صالح افراد کی تنظیم اور معاشرہ کی اصلاح کا جتنا جتنا کام ہوتا جائے، اسی نسبت سے ملک کے سیاسی نظام میں دین کے حامی عنصر کا نفوذ و اثر بڑھتا جائے (ایضاً، ص ۲۲۶)۔ انتخابات وہ پیمانہ ہے جس سے آپ یہ معلوم کرلیں گے کہ "چند سال تک آپ نے معاشرہ کی اصلاح کے لیے جو محنت کی ہے، اس سے حقیقت میں کتنی اصلاح ہوئی اور کتنی ابھی کرنی باقی ہے (ایضاً، ص ۲۱۳)۔

حکمتِ عملی کی قرارداد میں یہ اعتراف مضمر ہے --- اور اس اعتراف میں کوئی تامّل نہیں ہونا چاہیے کیونکہ دین کے حامی عناصر کا اثر و نفوذ اور انتخابات کا پیمانہ بھی یہی بتا رہا ہے --- کہ ہم توازن برقرار رکھنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں، اور نفاذِ شریعت کو لانے اور سہارنے کے لیے معاشرہ کی تیاری و استعداد میں مطلوب اضافہ نہیں ہوا۔ بلکہ ملک مسلسل جس معاشرتی، سیاسی اور معاشی بحران کا شکار ہے، اس کا اصل سبب بھی اس کا دینی اور اخلاقی بگاڑ ہے۔

آج پاکستان، بلکہ پورا عالمِ اسلام، جس دینی و اخلاقی بگاڑ میں مبتلا ہے، اس کی تصویر ہم کم و بیش ان الفاظ میں بڑی اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں جن کے ذریعہ ایک معاصر صاحبِ علم و فضل نے پانچویں صدی ہجری کے بغداد کا نقشہ کھینچا ہے: مسلمانوں کی بڑی تعداد علمی شبہات، خصوصی

امراض اور دین سے نفور کے بجائے عام اخلاقی کمزوریوں' عملی کوتاہیوں اور غفلت و جہالت کا شکار ہے۔ مسلسل تہذیبی زوال' صدیوں کی غلامی اور نااہل و مطلق العنان حکومتوں نے ان کے اخلاق کو بُری طرح متاثر کیا ہے۔ بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا ہے جس کا مقصدِ زندگی حصولِ دولت یا جاہ و عزت ہے' اور جو اگرچہ اعتقادی طور پر اور آخرت کا منکر نہیں' مگر عملاً خدا فراموش' آخرت سے غافل اور عیش و عشرت میں مست ہے۔ مغربی' ہندوی اور عجمی تہذیب و معاشرت نے بھی اسلامی زندگی میں اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں' اور ان کی عادات و فیشن اور جاہلی رسوم جزوِ زندگی بن گئی ہیں۔ زندگی کا معیار بہت بلند ہوگیا ہے' سوسائٹی کے مطالبات بہت بڑھ گئے ہیں۔ حکّام رَس' مزاج شناس' موقع پرست لوگوں کی ایک مستقل قوم پیدا ہوگئی ہے۔ متوسط طبقہ اُمرا کے نقشِ قدم پر ہے' اور عوام متوسط طبقہ کے اخلاق و عادات سے متاثر ہو رہے ہیں۔ جن کو وسائلِ معیشت حاصل ہیں' وہ غلط طریقہ پر ان کو استعمال کر رہے ہیں اور زندگی سے تمتع اور لطف اندوزی میں مصروف ہیں۔ جو امیرانہ ٹھاٹ باٹ سے محروم ہیں' وہ محرومی کی کوفت اور مسابقت کی آگ میں جل رہے ہیں۔ اہل دولت' ایثار و ہمدردی اور جذبۂ شکر سے خالی ہیں' اور تنگ حال' صبرو قناعت اور یقین و خودداری سے محروم۔ (سیّد ابوالحسن علی ندوی' تاریخ دعوت و عزیمت' ج ۱' ص ۲۴۹)

اس اخلاقی بگاڑ کے ساتھ ملک اور ملّت ان عظیم خطرات کا بھی کامیابی کے ساتھ مقابلہ نہیں کرسکتے' نہ ان امکانات سے پورا فائدہ اٹھا سکتے' جو تاریخ کے بہاؤ نے سامنے لاکھڑے کیے ہیں۔ کیونکہ' جو قرآن کو سچ مانتا ہے وہ جانتا ہے کہ مسلمانوں کی قوت و ترقی کا راز نہ قومی دولت کی مقدار اور پیداوار میں اضافہ میں ہے' نہ معاشی ترقی کی سالانہ شرح میں' نہ اسبابِ زندگی کی فراوانی میں' نہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں' نہ شرح خواندگی میں۔ یہ سب چیزیں ضروری ہیں' ان کے لیے کوشش بھی ضروری ہے' لیکن بتا دیا گیا ہے کہ یہ صرف اسی صورت میں حاصل ہوں گی کہ ایمان اور تقویٰ حاصل ہو۔ جو مومن اور مجاہد ہوں وہی سربلند اور معزز ہوں گے۔جو صرف اللہ کے بندے ہوں' زمین کی خلافت کی بشارت ان ہی کے لیے ہے۔جو صبر اور تقویٰ کے حامل ہوں وہی دشمن کے ہر کید کے ضرر سے محفوظ ہوں گے۔ اس کے علاوہ مسلمان جو راہ اختیار کریں گے وہ کھوٹی ہوگی' ہر تدبیر رائیگاں جائے گی' ہر منصوبہ لاحاصل رہے گا۔ ساری امت کی' اور بالخصوص ہمارے پاکستان کی' تقریباً نصف صدی کی تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہے۔

عدمِ توازن' یا کسی پہلو سے لائحہ عمل پر عملدر آمد میں کمی اور ناکامی کی بنا پر نہ پہلے کسی جز

کو ساقط کیا گیا' نہ آج کیا جاسکتا ہے۔ مگر کمی اور ناکامی کا مداوا کرنے اور توازن کو بحال کرنے کے لیے ہر ممکن طریقہ سے بھرپور کوشش ناگزیر ہے۔ خصوصاً اگر معاملہ عوامی اصلاح و تربیت کا ہو جس کی حیثیت پورے لائحہ عمل میں ریڑھ کی ہڈی کی ہے۔

---

مسلمان عوام کی اصلاح' ان کی دینی تعلیم و تربیت اور ان میں ایمان و جہاد کی روح پھونکنے کے سوا کسی اور طریقہ سے ممکن نہیں۔ دینی تعلیم و تربیت کے لیے دین کا علم پھیلانا ضروری ہے' مگر یہ کافی نہیں جب تک ان میں اس پر عمل کی استعداد بھی نہ پیدا ہو۔ دینی تعلیم میں قرآن مجید کی تعلیم کو سب سے اہم اور مرکزی حیثیت دینا ناگزیر ہے' لیکن صرف قرآن مجید کے دروس سن لینے اور اس کے معانی کا علم ہو جانے سے بھی کام نہیں بنے گا جب تک دل میں قرآن نہ اترے اور اس کے پیچھے چلنے کا ذوق اور شوق نہ ہو۔ لوگوں کو نمازی' پرہیزگار اور صحیح العقیدہ بنانا بھی ضروری ہے' لیکن اس سے بھی مطلوب حاصل نہ ہوگا جب تک لوگ فیصلہ کے وقت ہر تعصب' خوف' محبت اور لالچ سے بالاتر ہو کر اپنا وزن اقامت دین کے پلڑے میں ڈالنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ رسمی طور پر ہفتے منا لینے' مہمات چلانے اور پوسٹر اور اسٹکرز چسپاں کرنے سے بھی یہ مقصد ہرگز پورا نہ ہوگا۔ جماعت کے رائج تربیتی پروگرام بھی مفید مطلب نہیں کہ ان میں عام لوگوں کی شرکت ہی نہیں۔ ان سے صرف عوام کے لیے مربّی تیار ہو سکتے ہیں' اگرچہ چالیس سالہ تجربہ کے بعد اس پہلو سے بھی ان کی تشکیل نو کی شدید ضرورت ہے۔

اس وقت جب کہ ہماری زندگی ایک بحرانی کیفیت میں مبتلا ہے' ہمیں دراصل ایک ایسی "عوامی" دعوت و تحریک برپا کرنے کی ضرورت ہے جو عام مسلمانوں میں' ایمان کی حلاوت اور حرارت پیدا کرے' اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور وفاداری ان کے دلوں میں اتارے' آخرت کو ان کے لیے یقینی اور حقیقی بنائے' انھیں اپنے ربّ سے ملاقات کی تیاری میں لگائے' ان کے اندر جنت اور اطاعتِ الٰہی کا شوق' دوزخ کا خوف اور گناہوں سے توبہ و استغفار کا ذوق پیدا کرے' اربابِ دولت و اقتدار کی بے وقعتی اور مادی اسباب کی کمزوری کو ان پر آشکار کرے' ان کو اخلاقِ حسنہ' خصوصاً امانت و دیانت' پاسِ عہد' احترامِ آدمیت' عدل واحسان اور باہمی رحمت و محبت' کی طلب میں کوشاں کرے' اور ان کے اندر جذبۂ جہاد بیدار کرے۔ اقامتِ دین ہو یا امّت کا احیا' پاکستان میں نفاذِ شریعت ہو یا اس کی ترقی و استحکام' یا ان مقاصد کے لیے زمامِ کار کی تبدیلی' ایسی تحریک برپا کیے بغیر ممکن نہیں۔

بظاہر اتنی اعلیٰ خصوصیات کا عوامی پیمانہ پر حصول ناممکن نظر آتا' مایوسی طاری ہونے لگتی ہے' اور ہمت اور حوصلے جواب دینے لگتے ہیں۔ لیکن اگر انسانی معاشروں کے بارہ میں "غیرفطری" توقعات رکھنے کے بجائے یہ حقیقت پیشِ نظر رہے کہ وہ "انسانی" ہوتے ہیں' تو مایوسی اور پست ہمتی پر قابو پانا کچھ مشکل نہیں۔ جس طرح ایک عام انسان کی زندگی میں نیکی اور برائی دونوں ملی جلی موجود رہتی ہیں (خلطوا عملاً صالحا و آخر سیئا)' کیفیات میں نشیب و فراز ہوتا ہے' کبھی وہ اللہ کو یاد رکھتا ہے اور کبھی بھول جاتا ہے' کبھی ارادہ کا پکا اور کبھی کچا ثابت ہوتا ہے' یہی حال عام معاشرہ کا بھی ہوتا ہے۔ اس میں نیک بھی ہوں گے اور بد بھی' اس مطلوبہ رو کے خلاف چلنے والے ہوں گے' بعض اپنی اغراض کے لیے رَو میں بہنے والے ہوں گے' بعض صرف ساتھ آکر بیٹھ جانے والے ہوں گے' بعض کو ان مطلوبہ خصوصیات کا کثیر حصہ ملے گا اور بعض کو صرف رتی بھر' بعض پاکر کھو دیں گے اور کھونے کے بعد پھر طلب میں کوشاں ہوں گے --- لیکن بحیثیت مجموعی معاشرہ میں خیر اور صلاح' خدا پرستی اور آخرت طلبی' محبت اور اطاعت کی رَو جاری رہے گی۔ اس سلسلہ میں' مدینہ کا اوّلیں معاشرہ ہمیشہ ہمارے سامنے رہنا چاہیے۔ وہ ایک مثالی معاشرہ تھا' اور ساتھ ہی ایک انسانی معاشرہ کی ان تمام فطری خصوصیات کا حامل بھی' جن کو ہم نے مختصراً یہاں بیان کیا ہے۔

اس طرز کی عوامی اصلاح جاری ہونے کے نظائر ہماری تاریخ میں بے شمار موجود ہیں۔ ماضی قریب ہی میں' شاہ ولی اللہؒ اور ان کے دو بیٹوں نے فارسی اور اردو میں قرآن مجید کے ترجمے کرکے' اور براہِ راست قرآن مجید کی تعلیم کے سلسلے جاری کرکے' عام مسلمانوں تک قرآنی پیغام قرآن کی زبان میں پہنچانے کی جو تحریک برپا کی' اس کے پچھلے تین سو سال کے فیوض و برکات کا حساب کوئی مورخ نہیں لگا سکتا۔ پھر سید احمد شہیدؒ نے اپنی تحریک جہاد کے لیے' اور اس کے ذریعہ' ہفتوں اور مہینوں میں جس طرح لاکھوں لوگوں کے قلوب کو جگایا' ان کے اندر ایمان کی حرارت پیدا کی' انھیں راہِ توحید پر گامزن کیا اور شرک و بدعات سے دُور کیا' اور جذبہ جہاد سے سرشار کیا' وہ ایک مثالی عوامی اصلاحی تحریک کا کام تھا۔ جہاں سے وہ گزر جاتے تھے وہاں ایمان اور توبہ و استغفار کی ایک رَو دوڑ جاتی تھی۔ حتیٰ کہ ڈھاکہ وہ خود نہ جا سکے' لیکن جو علاقے آج بنگلہ دیش میں ہیں وہ برسوں ملک کے دوسرے کنارہ پر سرحد میں تحریکِ جہاد کے پشتیبان بنے رہے۔ بظاہر یہ تحریک ۱۸۳۲ میں بالاکوٹ میں "ناکام" ہوگئی' لیکن کون انکار کرسکتا ہے کہ آج تک برّصغیر میں جو دینی اور ایمانی زندگی اور حرکت و حرارت پائی جاتی ہے' وہ بڑی حد تک انھی کی تحریک کا

فیض ہے۔ پھر یہ سارا کام اس دور میں ہوا جب اغیار سر پر پہنچ چکے تھے، مسلمانوں کی حکومت منہدم ہو رہی تھی، اور امت مُسلمہ زوال و بگاڑ کی انتہائی پستیوں میں مبتلا تھی۔ اسی طرح پانچویں صدی ہجری کے بغداد میں، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے وسیع پیمانہ پر عوامی اصلاح کی تحریک برپا کی، اور ہمارے قریب کے زمانہ میں نائجیریا میں شیخ عثمان دان فودیو نے تو نہ صرف عوامی اصلاح اور جہاد کی تحریک برپا کی، بلکہ بالفعل ایک اسلامی ریاست قائم بھی کردی۔

سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں : اللہ تعالیٰ نے شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے قلب کی توجہ اور زبان کی تاثیر سے لاکھوں انسانوں کو نئی ایمانی زندگی عطا فرمائی۔ آپ کا وجود اسلام کے لیے ایک بادِ بہاری تھا جس نے دلوں کے قبرستان میں نئی جان ڈال دی اور عالمِ اسلام میں ایمان و روحانیت کی نئی لہر پیدا کردی۔ شیخ محمد عمر کیسائیؒ کہتے ہیں کہ کوئی مجلس ایسی نہ ہوتی تھی جس میں یہودی اور عیسائی اسلام نہ قبول کرتے ہوں، اور رہزن، خونی اور جرائم پیشہ توبہ سے مشرف نہ ہوتے ہوں، فاسد الاعتقاد اپنے غلط عقاید سے توبہ نہ کرتے ہوں۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ بغداد کی آبادی کا بڑا حصہ آپ کے ہاتھ پر توبہ سے مشرف ہوا۔ (ایضاً، ج ۱، ص ۲۵۸)

سید احمد شہیدؒ کے بارے میں وہ لکھتے ہیں : "مصلحین اور علماو مشائخ نے بے شبہ اسلام کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، اور دے رہے ہیں۔ ہزاروں بندگان خدا کو ان سے ہدایت نصیب ہوئی، ہزاروں کو ان کی وجہ سے کلمہ نصیب ہوا، ہزاروں کے خاتمے اچھے ہوئے، آج بھی رسول اللہ صلیٰ اللہ علیہ وسلم کا یہ فیض ان سے جاری ہے، لیکن ان سب کے حلقے اور عمل کے دائرے محدود ہیں۔

سید صاحبؒ نے اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھا کہ حکومتِ الٰہی کے قیام اور اسلامی نظامِ حیات و قوانین و حدود کے اِجرا اور ماحول کی تبدیلی کے بغیر یہ سب کوششیں "کوہ کندن دکاہ بر آوردن" ثابت ہوں گی۔ صرف چند لوگوں کی اصلاح ہوگی، لیکن ضرورت فضا بدلنے اور جڑ مضبوط کرنے کی ہے۔ آپ اسی نقشہ پر کام کرنا چاہتے تھے، جس پر رسول اللہؐ اور آپؐ کے خلفائے راشدینؓ نے کیا۔ اور تجربہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ اور پائیدار کامیابی اسی کو ہوئی اور قیامت تک اسلام کی ترقی کے لیے وہی نظامِ عمل ہے۔۔۔

اس کے بعد سید صاحبؒ کی ایک اور خصوصیت پر نظر ڈالیے۔ وہ یہ کہ آپ نے تھوڑے زمانہ میں ایک دینی فضا قائم کردی، اور ایک ایسی جماعت پیدا کردی جس کی صحیح تعریف یہ ہے کہ وہ تیرھویں صدی میں صحابہؓ کا نمونہ تھے : ایک رنگ میں رنگے ہوئے، ایک سانچہ میں ڈھلے

ہوئے' اللہ کے لیے جان دینے والے' شریعت پر جینے اور مرنے والے' بدعتوں سے نفور' شرک کے دشمن' جہاد کے نشہ میں سرشار' متقی اور عبادت گزار' اور بڑی بات یہ ہے کہ ہم رنگ و یک آہنگ --- کیفیاتِ ایمان کے جان نواز جھونکے تاریخِ اسلام میں بارہا چلے ہیں' لیکن ایمان و یقین اور خلوص و للّٰہیت کی ایسی بادِ بہاری ہمارے علم میں کم سے کم اس ملک میں اس سے پہلے نہیں چلی۔ (ایضاً ج ۶' ص ۵۶ تا ۶۰)

---

ان تاریخی نظائر میں ایک بنیادی چیز جو مشترک ہے --- اور جو رسول اللہؐ کے اسوۂ حسنہ کے اتباع ہی کی وجہ سے مشترک ہے --- وہ' آج کی زبان میں "عوامیت" اور قرآن کی زبان میں "للنّاس" ہے۔ یعنی ان شخصیتوں اور جماعتوں نے عوام النّاس کی اصلاح و تربیت کا بیڑا اٹھایا' ان سے گہرا اور وسیع ربط و ضبط رکھا' انھی کے درمیان رہے' انھی کے ہو کر رہے' ان میں سے گناہ گاروں کو بھی بُلا کر اپنے پاس بٹھایا' ان کو چکارا' جھاڑا پونچھا' اور جو جتنے کام کے بن سکتے تھے' بنا دیا' جو جتنے کام میں لگ سکتے تھے' لگا دیا۔

آج' مستقبل کی حکمتِ عملی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے' عوام کی دینی تعلیم و تربیت کے ضمن میں ہمیں کیا کام کرنا چاہیں --- اور ان میں سے اکثر کام روزِ اوّل ہی سے ہمارے پیش نظر تھے' اب صرف تلافی مافات کے لیے کمر باندھنا ہے --- ان کے بارہ میں ہم آیندہ گفتگو کریں گے۔ لیکن ہم نے جس اُمر کی نشاندہی "عوامیت" کے عنوان سے کی ہے' وہ ان تمام کاموں کو کماحقہٗ سرانجام دینے کے لیے سب سے اہم اور ناگزیر شرط ہے۔

سیّد احمد شہیدؒ کے اصلاحی دَوروں کے کچھ واقعات سنیے' جن کے ذریعہ انھوں نے حکومت الٰہی کے قیام کی خاطر جہاد کے لیے عوامی قوت فراہم کی:

"محمد عثمان بیعت میں داخل ہوئے' ان کی وضع بالکل سپاہیانہ تھی۔ آپ نے فرمایا! "بھائی' اگرچہ اس وقت تمھارا ظاہر اچھا نہیں' لیکن تمھارا باطن صاف ہے۔ اِن شاء اللہ چند دنوں میں ظاہر بھی باطن کی طرح ہو جائے گا"۔ ان کے گھر کی مستورات بھی بیعت ہوئیں۔

ہمت خان نے جب آپ کے ہاتھ پر بیعت کی تو عرض کیا : "میں اپنے کھیت میں نماز پڑھا کرتا ہوں' مسجد نہیں جا سکتا"۔ آپ نے فرمایا کہ "تمھارے غلّہ کی پیداوار میں برکت ہوگی"۔

"سہارن پور میں ولی محمد نے جو بڑے متمول رئیس تھے بڑے اِعزاز و اہتمام کے ساتھ دعوت کی' اور اپنے تمام اِعزہ و عملہ کے ساتھ مرید ہوئے۔ ان کی یہاں کی مستورات بھی بیعت میں

داخل ہوئیں۔ ولی محمد صاحب نے درخواست کی : "اللہ کے فضل سے دنیاوی مال و دولت کی کمی نہیں' صرف یہ دعا چاہتا ہوں کہ اسراف و فضول خرچی سے اللہ محفوظ رکھے' اور اللہ کا دیا ہوا اللہ ہی کے راستہ میں کام آئے۔" آپ نے ان کی خواہش کے مطابق ان کے لیے اور ان کی ترقی ایمان کے لیے دعا فرمائی۔

سہارنپور میں قصابوں کی برادری کے کئی گھر تھے۔ ان میں اکثر آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر بیعت سے مشرف ہوئے۔ ہیئت ان کی یہ تھی کہ مونچھیں بڑھی ہوئی' زلفیں دراز' لنگوٹ بندھے ہوئے جس سے صرف شرم گاہ چھپی ہوتی۔ آپ نے ان کو نصیحت فرمائی کہ: "تمھاری صورت بالکل ہندوؤں کی سی ہے۔ مونچھیں تراشو' زلفیں رکھنا چھوڑو' پاجامہ پہنو اور یہ لنگوٹ اتارو اور پنج وقتہ نماز کی پابندی کرو۔" انھوں نے سب باتیں قبول کیں۔

تحصیل دار دھوکل سنگھ آئے' اور کھڑے کھڑے عرض کیا کہ کل اس غلام کے ہاں جناب کی دعوت ہے۔ آپ نے فرمایا "تشریف رکھیے"۔ انھوں نے کہا "جب تک میری دعوت نہیں قبول ہوگی' نہیں بیٹھوں گا۔" آپ نے فرمایا : "قبول ہے۔"

ایک بازاری عورت تائب ہوئی۔ آپ نے بٹھانے کے لیے عورتوں کی کشتی کی طرف بھیجا۔ عورتیں چیخنے لگیں کہ یہ بازاری عورت ہے' ہم تو اپنی ناؤ پر نہیں بٹھائیں گے۔ مولانا عبدالحئیؒ نے یہ بات سنی تو وہاں سے اٹھ کر کشتی کے قریب ہوگئے' اور عورتوں سے کہا: "تم اس نیک بخت کو اپنی ناؤ پر کیوں نہیں بٹھاتیں ؟ آج اس نیک بخت نے سب بُرے کاموں سے توبہ کی ہے' اس وقت یہ تم سب سے افضل ہے' اور جو کچھ خدا اور رسولؐ کا شرعی حکم تم پر ہے وہی اس پر ہے۔" ان سب نے کہا : اگر یہی بات ہے' تو اس کو پردہ کرا کر چھت پر بٹھادو۔" مولانا نے کہا : "چھت پر کیا تم میں سے کوئی نہیں بیٹھ سکتی' وہی کیوں بیٹھے؟" کچھ اور زیادہ گفتگو ہوئی' تو مولانا نے خفا ہو کر فرمایا : "اس میں عبدالحئیؒ کی جو بیوی ہو' وہ چادر اوڑھ کر کشتی پر سے اتر آئے۔" دوبار کہنے سے تو وہ نہیں اتریں' تیسری بار' سر سے پاؤں تک چادر اوڑھ کر مولانا کی بیوی ناؤ سے اتر کر خشکی میں کھڑی ہوگئیں۔

(کلکتہ میں) رات کو عورتوں کا ہجوم ہوتا' کوٹھی کے زنانہ مکان کے متصل کمرہ تین چار سو عورتوں سے بھر جاتا۔ سید صاحب کمرہ کے دروازہ پر تشریف لاتے' اور دو تین پگڑیاں ان میں پھیلا دیتے اور فرماتے کہ "ان سب کو مل کر پکڑلو۔" تب آپ ان سے بیعت کے الفاظ کہلاتے۔ پھر

کمرہ خالی کرا دیا جاتا' اور دوسری عورتوں سے بھر جاتا۔ اسی طرح ان سے بیعت لیتے۔ ہر شب کو آٹھ دس بار عورتوں سے وہ کمرہ بھرا جاتا اور خالی کیا جاتا"۔

یہ تو چند واقعات ہیں' ورنہ ایک ہی مصلح کی یہ حکایت بہت طویل بھی ہے' اور لذیذ بھی۔ ان واقعات کو بیان کرنے سے مقصود ان طریقوں کی تلقین کرنا یا ان پر بحث چھیڑنا نہیں جو اس زمانہ میں رائج تھے؛ مثلاً بیعت کا طریقہ' بلکہ عوامی اصلاح و تربیت کے مختلف اہم گوشوں کو آشکار کرنا ہے' جو ہر زمانہ میں پیش نظر رہنا چاہیے۔

ورنہ اس ضمن میں تو شیخ نظام الدین اولیا" کی یہ بات بڑی بالغ نظری پر مبنی ہے: "خدا تعالیٰ نے ہر زمانہ میں اپنی حکمتِ بالغہ کی ایک خاصیت پیدا کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ کے آدمیوں کا طریقہ اور رسم و رواج علیحدہ ہوتا ہے' اور زمانہ کی رفتار لوگوں میں اس درجہ اثر کرتی ہے کہ زمانہ موجودہ کے لوگوں کے مزاج اور طبیعت گزشتہ لوگوں کے طبائع سے بالکل مشابہت نہیں رکھتے۔ بہت کم آدمی ایسے ہوتے ہیں جن کی طبیعتیں پہلے لوگوں کی طبیعتوں سے جا ملتی ہوں۔ یہ بات تجربات سے خوب واضح ہوتی ہے۔

اس لیے اصلاح و تربیت کے لیے ہر زمانہ میں اُس زمانہ کے موافق جو طریقے ٹھیک ہوں' وہی اختیار کرنا چاہیے۔"

ایک خیال یہ بھی دل میں پیدا ہونا بجا ہے کہ اس پیمانہ کی عوامی اصلاح و تربیت کی تحریک برپا کرنا تو اسی پیمانہ کی شخصیتوں کے لیے ممکن تھا۔ آج کے زمانہ میں ایسی کوئی شخصیت نظر نہیں آتی' تو دینی تعلیم و تربیت کی تحریک کیسے برپا ہوگی۔ شخصیت کا رول یقیناً اہم ہے' آج بھی کوئی عظیم شخصیت ہو تو یقیناً یہ عظیم کام سرانجام دینا آسان ہوگا' لیکن اللہ تعالیٰ نے اس فریضہ کی ادائیگی کو شخصیت کی موجودگی سے مشروط نہیں فرمایا ہے۔ اگر شخصیت ناگزیر ہوتی' تو وہ یقیناً اس فریضہ کی ادائیگی کو اس شرط کے ساتھ مشروط فرماتا۔ لیکن امّت کے بارہ میں تو اس نے یہ بیان کیا ہے: (وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۤءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ: التوبہ ۹: ۷۱) یعنی "مومن مرد اور مومن عورتیں' یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں' بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں"۔ اور پوری انسانیت کے لیے اس نے اُمّت کو ذمہ دار بنایا ہے: (كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ: آل عمران ۳: ۱۱۰) یعنی "اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو' بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے

ہو"۔

ہمارے دلوں میں اللہ اور رسولؐ کی محبت کی چنگاری ہو' ربّ سے ملاقات کی تیاری کی فکر ہو' اور جذبۂ جہاد کا شعلہ ہو' تو دیئے سے دیا جل سکتا ہے' ممکن نہیں کہ جہاں حرارت ہو اس کی گرمی گردوپیش تک منتقل نہ ہو۔ اپنی چنگاری کو پھونکنے' اور اس سے دوسروں کے دلوں میں چنگاریاں جلانے ہی سے اپنے دل میں وہ حرارت اور استعداد پیدا ہوگی' جس کے بل پر ایک جماعت بھی ایک عظیم عوامی اصلاح و تربیت کی تحریک برپا کرسکے۔ اِن شَاءَ اللّٰہُ العَظِیم وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیز ۔

یہ کام کیسے کریں' اس پر ہم اِن شَاءَ اللہ آیندہ شمارہ میں گفتگو کریں گے۔

---

آج میں ترجمان القرآن کے بارہ میں بھی آپ کے سامنے چند باتیں رکھنا چاہتا ہوں :
سیّد مودودیؒ سے لے کر محترم نعیم صدیقی صاحب تک' جس درجہ کے لوگوں نے اس رسالہ کی ادارت کی ' ان کو دیکھتے ہوئے میں ہرگز اپنے کو اس کا اہل نہ پاتا تھا' نہ اندر سے یہ ہمت پاتا تھا کہ اس عظیم اور قیمتی امانت کا بار اٹھاؤں۔ لیکن کیوں کہ بزرگوں سے یہی سیکھا ہے کہ جب اللہ تعالٰی کوئی کام ڈال دے' اور اس سے اس کے دین کا اور خلقِ خدا کا نفع بھی وابستہ ہو' اور طبیعت میں عزم بھی پایا جاتا ہو' تو اللہ پر توکل کرکے اس کام کا بار اٹھا لیا جائے' مدد بھی وہی کرے گا' دستگیری بھی وہی کرے گا۔

اگست ۱۹۹۱ سے یہ گراں بار ذمہ داری میرے سپرد کی گئی۔ اُسی وقت سے دو عزائم سامنے تھے : ایک یہ کہ اس کو حُسنِ ظاہر و باطن کے لحاظ سے خوب سے خوب تر بنانے کی اپنی سی کوشش کی جائے۔ دوسرے یہ کہ اس کی اشاعت وسیع سے وسیع تر کی جائے۔ جنوری ۱۹۹۴ میں یہ نوبت آئی کہ دونوں اہداف کے حصول کے لیے پیش رفت شروع ہو۔

یہ سراسر اللہ کا فضل تھا ـــــ اور اس پر میں اس کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے' جتنا سوچتا ہوں کہ کتنا بڑا فضل ہوا اتنا ہی اپنے شکر کی درماندگی کا احساس ہوتا ہے ـــــ کہ چار ماہ میں اس رسالہ کی اشاعت پانچ چھ ہزار سے بڑھ کر اکیس ہزار تک پہنچ گئی۔ یہ اضافہ بھی اللہ کے فضل کا نتیجہ تھا کہ اس نے بے شمار بھائیوں اور بہنوں کے دلوں میں میری درخواستوں کے لیے قبولیت پیدا کر دی۔ اور آپ کی انتھک محنت اور تعاون کے نتیجہ میں یہ اضافہ وجود میں آیا۔ اور اس محنت و تعاون کے لیے میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ یہ اضافہ اس بات کی علامت بھی تھا کہ حسنِ

ظاہر و باطن کے لحاظ سے جو بُری بھلی کاوشیں میں اور میرے رفقائے کار کر رہے ہیں ان کو قارئین نے پسند کیا ہے۔ میرے لیے اس خبر سے زیادہ جانفزا کوئی خبر نہیں ہوتی کہ لوگ شوق اور پسند سے رسالہ خریدتے ہیں اور پڑھتے ہیں۔ اس کے معیار کو بلند کرنے کے لیے شکریہ کے اصل مستحق میرے رفقائے کار کی ٹیم ہے' جو کسی مادی منفعت کے بغیر دل و جان سے اس کام میں لگی ہوئی ہے۔

لیکن اِس رسالہ کے جاری ہوتے ہی شکایتوں کا ایک تار بندھ گیا' سب سے عام شکایت یہ تھی کہ چندہ (بذریعہ وی پی / نقد) ادا کردیا مگر پرچہ نہیں مل رہا۔ آرڈر کے باوجود پرچہ نہ بھیجنے اور خطوط کا جواب نہ ملنے کی شکایات اس پر مستزاد۔ آہستہ آہستہ میرے وقت' توجہ' فکر کا بیشتر حصہ انھی کی نذر ہونے لگا' لیکن کسی طرح اصلاح رونما ہوتی نظر نہ آئی۔ چنانچہ میں نے انتظامیہ کو تبدیل کر دیا۔ تحقیقات سے یہ افسوس ناک انکشاف ہوا کہ رقوم وصول ہو رہی تھیں مگر ان کا اندراج نہ ہو رہا تھا۔ ابھی اس حادثہ سے میں سنبھلنے بھی نہ پایا تھا' کہ یہ شکایات ملنے لگیں کہ جن کو مئی جون تک پرچہ مل رہا تھا' ان کی بھی ایک تعداد کو جون جولائی سے پرچہ ملنا بند ہوگیا۔ یہ بات انتہائی شرمندگی کی بھی تھی' اور ناقابل فہم بھی۔ گزشتہ ہفتہ کی تحقیقات سے پتہ چلا کہ پرانے دفتری کارکن رخصت ہوئے' تو ساتھ ہی بے شمار خریداروں کے کارڈ اور پتے بھی غائب ہوگئے۔ اس حادثہ کا جو اثر میرے اوپر پڑا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ فَإِلَى اللّٰهِ الْمُشْتَكَى وَهُوَ الْمُسْتَعَانُ کے سہارے ہی جھیل سکا ہوں۔ ترجمان کی زندگی میں اس قسم کا یہ حادثہ پہلا نہیں۔ سید مودودیؒ بھی ایسے حوادث سے گزرے تھے' یہ بھی میرے لیے ایک وجہ تسلی ہے۔

یہ چند سطور اس لیے لکھ رہا ہوں تاکہ صورتِ حال آپ سب کے علم میں آجائے' آپ دوسروں کے علم میں لے آئیں' اور ہم سب مل کر اس کے مداوا کی کوشش کریں۔ چند روز تحقیقات مکمل کرنے میں لگیں گے۔ اس کے بعد جو ممکن تدابیر ہوں گی وہ اختیار کی جائیں گی۔ ظاہر ہے کہ جن کے پتے غائب ہو گئے ان کو تو میری یہ چند سطور بھی نہیں پہنچیں گی۔ لیکن آپ ہوں' آپ کے علم میں کوئی خریدار ہوں' کسی کو آپ نے خریدار بنایا ہو' اگر وہ ہمیں یہ لکھیں کہ وہ کس ماہ سے خریدار ہیں' اور ان کو کون سے پرچے نہیں ملے' تو اِن شاء اللہ ہم ان کا نام خریداروں کی فہرست میں داخل کرلیں گے' اور ان کو سابقہ پرچے ارسال کریں گے۔

میں ان سب احباب سے معافی کا خواستگار ہوں جن پر اس دست بُرد کی زد پڑی ہے' اور امید رکھتا ہوں کہ وہ ترجمان کو اپنا سمجھ کر اس کے ساتھ تعاون جاری رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے گا۔

---

# بددلی

(بددل شخص) اپنی بددلی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے ہر طرف نظر دوڑاتا ہے۔ مختلف افراد کی انفرادی کمزوریاں چن چن کر جمع کرتا ہے۔ جماعت کے نظام اور اس کے کام میں نقائص ڈھونڈتا ہے اور ایک فہرست بنا کر سامنے رکھ دیتا ہے کہ یہ ہیں وہ خرابیاں جنھیں دیکھ کر آخر کار یہ خاکسار بددل ہو گیا ہے۔ یعنی اس کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ مجھ جیسا مرد کامل جو سب کمزوریوں سے پاک تھا' ان کمزور ساتھیوں اور ان نقائص سے لبریز جماعت کے ساتھ کس طرح آگے چل سکتا ہے اور یہ طرز استدلال اختیار کرتے وقت شیطان اسے یہ بات بھلا دیتا ہے کہ اگر واقعی معاملہ یہ تھا تو سست پڑنے کی بجائے یہ تو اور زیادہ سرگرم ہونے کے متقاضی تھا۔ جس کام کو آپ اپنی زندگی کا نصب العین ٹھہرا کر انجام دینے کے لیے اٹھے تھے۔ اسے اگر دوسرے اپنی خامیوں سے بگاڑ رہے تھے تو آپ اور زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اسے بنانے میں لگ جاتے اور اپنی خوبیوں سے دوسروں کی ان خامیوں کا تدارک فرماتے۔ آپ کے گھر میں آگ لگی ہو اور گھر کے دوسرے افراد اسے بجھانے میں کوتاہی برتیں تو آپ بددل ہو کر بیٹھ جائیں گے یا جلتے ہوئے گھر کو بچانے کے لیے ان کوتاہ دستوں سے بڑھ کر چابک دستی دکھائیں گے۔

(ایک بندہ خدا)

# ۶۰ سال پہلے

رحمٰن اور رحیم دونوں رحمت سے مشتق ہیں۔ اور ان دونوں صفتوں کا اطلاق حق جل و علا پر ایسا ہی حقیقی ہے جیساکہ علیم و قدیر اور سمیع و بصیر کا اطلاق اس پر حقیقی ہے۔ اور جس طرح اس کی حیات ہماری حیات کی طرح نہیں اور اس کا سننا اور دیکھنا اور کلام کرنا ہمارے سننے اور دیکھنے اور کلام کرنے کے مشابہ نہیں اسی طرح اس کی رحمت بھی ہماری رحمت کے مماثل نہیں۔

---- کلامِ عرب میں وزن فعلان' اکثر صفاتِ عارضہ اور اوصافِ متجددہ اور حادثہ کے لیے مستعمل ہوتا ہے جیسے عطشان و ریان و غضبان وغیرہ۔ لہٰذا لفظ رحمٰن سے اس دار حدوث و تجدد اور دار فانی کی طرف اشارہ مناسب ہوا۔

رحیم صفت مشبّہ کا صیغہ ہے جو دوام اور استمرار پر دلالت کرتا ہے۔ فعیل کا وزن کلامِ عرب میں معانی ثابتہ کے لیے مستعمل ہوتا ہے جیساکہ علیم و حکیم' حلیم و جمیل۔ لہٰذا لفظ رحیم سے دارِ باقی اور عالمِ جاودانی کی طرف اشارہ مناسب ہوا۔

علامہ آلوسی کے کلام سے رحمٰن اور رحیم میں یہ فرق معلوم ہوتا ہے کہ رحمٰن سے عام رحمت مراد ہے' خواہ بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ صورۃً اور معنیً۔ ظاہراً اور باطناً ہر طرح سے رحمت ہو یا فقط معنیً ہو اور باطناً رحمت ہو' اگرچہ صورت اور ظاہر کے لحاظ سے وہ عذاب ہو جیسے مریض کو تلخ دوا کا پلانا صورۃً ایلام اور تکلیف ہے مگر معنیً سراسر رحمت ہے۔ پس رحمٰن سے ایسی ہی عام رحمت مراد ہے جو ان تمام انواع و اقسام کو شامل ہو' یہ دارفانی اسی قسم کی رحمت کا محل ہے۔ کبھی اس کی رحمت راحت و انعام کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی مصائب و آلام کی صورت میں' کما قال تعالیٰ (عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ) اور رحیم سے وہ رحمت مراد ہے جو بلاواسطہ ہو اور ظاہراً اور باطناً ہر طرح سے رحمت ہی رحمت ہو۔ دارِ آخرت میں اسی قسم کی رحمت ہو گی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاواسطہ بھی ہو گی اور کسی قسم کا اس میں شائبہ رنج و الم کا بھی نہ ہو گا۔

(مولانا محمد ادریس کاندھلوی' ترجمان القرآن' جلد ۴' نمبر ۶' جمادی الاخری ۱۳۵۳ھ : اکتوبر ۱۹۳۴ء' ص ۵۵)

# مزاج کی بے اعتدالی اور تنگ دلی

دوسرا درجہ ان خرابیوں کا ہے جن کے لیے موزوں ترین نام "مزاج کی بے اعتدالی" ہے۔ نفسانیت کے مقابلے میں یہ ایک معصوم نوعیت کی کمزوری ہے' کیونکہ اس میں کسی بدنیتی' کسی بُرے جذبے' کسی ناپاک خواہش کا دخل نہیں ہوتا ہے۔ لیکن خرابی پیدا کرنے کی قابلیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ نفسانیت کے بعد دوسرے نمبر پر آتی ہے' بلکہ بسا اوقات اس کے اثرات و نتائج اتنے ہی خراب ہوتے ہیں جتنے نفسانیت کے اثرات و نتائج۔

مزاج کی بے اعتدالی کا فطری نتیجہ نظروفکر کی بے اعتدالی اور عمل و سعی کی بے اعتدالی ہے' اور یہ چیز زندگی کے حقائق سے براہِ راست متصادم ہوتی ہے۔ انسانی زندگی بے شمار متضاد عناصر کی مصالحت اور بہت سے مختلف عوامل کے مجموعی عمل کا نتیجہ ہے۔ جس دنیا میں انسان رہتا ہے اس کا بھی یہی حال ہے۔ انسانی افراد میں سے ہر ایک فرداً فرداً بھی ایسا ہی بنایا گیا ہے' اور انسانوں کے ملنے سے جو اجتماعی ہیئت بنتی ہے' اس کی کیفیت بھی یہی ہے۔ اس زندگی میں کام کرنے کے لیے فکر و نظر کا ایسا توازن اور سعی و عمل کا ایسا اعتدال درکار ہے جو مزاجِ کائنات کے توازن و اعتدال کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ ہو۔ حالات کے ہر پہلو پر نگاہ رکھی جائے' معاملات کے ہر رُخ کو دیکھا جائے' ضروریات کے ہر گوشے کو اس کا حق دیا جائے' فطرت کے ہر تقاضے کو ملحوظ رکھا جائے۔ کمال درجے کا معیاری اعتدال چاہے نصیب نہ ہو' مگر یہاں کامیابی کے لیے بہر حال اعتدال ناگزیر ہے۔ جتنا بھی وہ معیار سے قریب ہو گا اتنا ہی مفید ہو گا' اور جس قدر وہ اس سے دور ہو گا اسی قدر زندگی کی حقیقتوں سے متصادم ہو کر نقصان کا موجب بنے گا۔ دنیا میں آج تک جتنا بھی فساد رُونما ہوا

ہے اور آج رُونما ہے' اسی وجہ سے ہے کہ غیر متوازن دماغوں نے انسانی مسائل کو یک رُخے پن سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوششیں کیں' ان کو حل کرنے کے لیے غیر متوازن اسکیمیں بنائیں' اور ان کو نافذ کرنے کے لیے غیر معتدل طریقے اختیار کیے۔ یہی بگاڑ کا اصل سبب ہے' اور بناؤ کا جو کچھ کام بھی ہو سکتا ہے فکر و نظر کے توازن اور طریقِ عمل کے اعتدال ہی سے ہو سکتا ہے۔

یہ وصف خاص طور پر تعمیرو اصلاح کی اس اسکیم کو نافذ کرنے کے لیے اور بھی زیادہ ضروری ہے جو اسلام نے ہمیں دی ہے' کیونکہ وہ بجائے خود توازن و اعتدال کے انتہائی کمال کا نمونہ ہے۔ اس کو کتابوں کے صفحات سے واقعات کی دنیا میں منتقل کرنے کے لیے تو خصوصیت کے ساتھ وہی کارفرما اور کارکن موزوں ہو سکتے ہیں جن کی نظر اسلام کے نقشۂ تعمیر کی طرح متوازن اور جن کا مزاج اسلام کے مزاجِ اصلاح کی طرح معتدل ہو۔ افراط و تفریط میں مبتلا ہونے والے انتہا پسند لوگ اس کام کو بگاڑ تو سکتے ہیں' بنا نہیں سکتے۔

نتائج کے اعتبار سے بے اعتدالی کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ وہ بالعموم ناکامی کی موجب ہوتی ہے۔ نظام زندگی میں اصلاح و تغیر کی کوئی اسکیم بھی لے کر آپ اٹھیں' آپ کی کامیابی کے لیے صرف یہ بات کافی نہیں ہے کہ آپ خود اس کے برحق ہونے پر مطمئن ہوں' بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ اپنے معاشرے کے عام انسانوں کو اس کے صحیح' مفید اور قابل عمل ہونے پر مطمئن کر دیں' اور اپنی تحریک کو اس شکل میں لائیں اور ایسے طریقے سے چلائیں جس سے لوگوں کی امیدیں اور عایتیں اس کے ساتھ وابستہ ہوتی چلی جائیں۔ یہ بات صرف اسی تحریک کو نصیب ہو سکتی ہے جو نظرو فکر میں بھی متوازن اور طریق عمل میں بھی متوازن ہو۔ ایک انتہا پسندانہ اسکیم جو انتہا پسندانہ طریقوں سے چلائی جائے' عام انسانوں میں اپنے لیے رغبت اور امید پیدا کرنے کے بجائے معترض اور غیر مطمئن بناتی ہے' اور اس کی یہ صفت خود ہی اس کی قوت تبلیغ اور قوت نفوذ کو ضائع کر دیتی ہے۔ اس کو بنانے اور چلانے کے لیے کچھ انتہا پسند لوگ اکٹھے ہو بھی جائیں' تو سارے معاشرے کو اپنے جیسا انتہا پسند بنا لینا اور دنیا بھر کی آنکھیں حقائق سے بند کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

خود اس جماعت کے لیے بھی یہ چیز زہر کا حکم رکھتی ہے جو اجتماعی اصلاح و تعمیر کا کوئی پروگرام لے کر اٹھی ہو۔ اور یہ آسان کام نہیں ہے۔

## یک رخا پن

مزاج کی بے اعتدالی کا اولین مظہر انسان کے ذہن کا ایک رُخا پن ہے۔ اس کیفیت میں مبتلا ہو کر آدمی بالعموم ہر چیز کا ایک رُخ دیکھتا ہے' دوسرا رُخ نہیں دیکھتا۔ ہر معاملے میں ایک پہلو کا لحاظ کرتا ہے' دوسرے کسی پہلو کا لحاظ نہیں کرتا۔ ایک سمت جس میں اس کا ذہن ایک دفعہ چل پڑتا ہے اسی کی طرف وہ بڑھتا چلا جاتا ہے' دوسری سمتوں کی جانب توجہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس سے معاملات کو سمجھنے میں مسلسل ایک خاص طرح کا عدم توازن کا شکار ہوتا ہے۔ رائے قائم کرنے میں بھی وہ ایک ہی طرف جھکتا چلا جاتا ہے۔ جس چیز کو اہم سمجھ لیتا ہے بس اسی کو پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے' دوسری ویسی ہی اہم چیزیں بلکہ اس سے بھی اہم چیزیں اس کے نزدیک غیر وقیع ہو جاتی ہیں۔ جس چیز کو بُرا سمجھ لیتا ہے' اسی کے پیچھے پڑ جاتا ہے' دوسری ویسی ہی بلکہ اس سے زیادہ بڑی برائیاں اس کے نزدیک قابل توجہ نہیں ہوتیں۔ اصولیت اختیار کرتا ہے تو جمود کی حد تک اصول پرستی میں شدت دکھانے لگتا ہے' کام کے عملی تقاضوں کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ عملیت کی طرف جھکتا ہے تو بے اصولی کی حد تک عملی بن جاتا ہے' اور کامیابی کو مقصود بالذات بنا کر اس کے لیے ہر قسم کے ذرائع وسائل استعمال کر ڈالنا چاہتا ہے۔

### انتہا پسندی

یہ کیفیت اگر اس حد پر نہ رک جائے تو آگے بڑھ کر یہ سخت انتہا پسندی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ پھر آدمی اپنی رائے پر ضرورت سے زیادہ اصرار کرنے لگتا ہے۔ اختلاف رائے میں شدت برتنے لگتا ہے۔ دوسروں کے نقطۂ نظر کو انصاف کے ساتھ نہ دیکھتا ہے' اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے' بلکہ ہر مخالف رائے کو بدتر سے بدتر معنی پہنا کر ٹھکرانا اور ذلیل کرنا چاہتا ہے۔ یہ چیز روز بروز اسے دوسروں کے لیے اور دوسروں کو اس کے لیے ناقابلِ برداشت بناتی چلی جاتی ہے۔

اس مقام پر بھی بے اعتدالی رُک جائے تو خیریت ہے۔ لیکن اگر اسے خوبی سمجھ کر مزید پرورش کیا جائے' تو پھر معاملہ بد مزاجی اور چڑچڑے پن اور تیز زبانی اور دوسروں کی نیتوں پر شک اور حملوں تک پہنچ جاتا ہے' جو کسی اجتماعی زندگی میں نبھنے والی چیز نہیں ہے۔

### اجتماعی بے اعتدالی

ایک آدمی یہ رَوِش اختیار کرے تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہی ہو گا کہ وہ اکیلا جماعت سے

کٹ جائے گا' اور اس مقصد کی خدمت سے محروم ہو جائے گا جس کی خاطروہ جماعت سے وابستہ ہوا تھا۔ اس سے کوئی اجتماعی نقصان نہ ہو گا۔ مگر جب کسی اجتماعی ہیئت میں بہت سے غیر متوازن ذہن اور غیر معتدل مزاج جمع ہو جائیں' تو پھر ایک ایک قسم کا عدم توازن ایک ایک ٹولی کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے۔ ایک انتہا کے جواب میں دوسری انتہا پیدا ہوتی ہے۔ اختلافات شدید سے شدید تر ہوتے جاتے ہیں' پھوٹ پڑتی ہے' دھڑے بندی ہوتی ہے' اور اس کش مکش میں وہ کام خراب ہو کر رہتا ہے جسے بنانے کے لیے بڑی نیک نیتی کے ساتھ کچھ لوگ جمع ہوئے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کام انفرادی کوششوں سے کرنے کے نہیں ہوتے' بلکہ جن کی نوعیت ہی اجتماعی ہوتی ہے' انھیں انجام دینے کے لیے بہرحال بہت سے لوگوں کو ساتھ مل کر کام کرنا ہوتا ہے۔ ہر ایک کو اپنی بات سمجھانی اور دوسروں کی بات سمجھنی ہوتی ہے۔ طبیعتوں کا اختلاف' قابلیتوں کا اختلاف' ذاتی خصوصیات کا اختلاف' اپنی جگہ رہتا ہے۔ اس کے باوجود سب کو آپس میں موافقت کا ایک تعلق پیدا کرنا ہوتا ہے' جس کے بغیر کوئی تعاون ممکن نہیں ہوتا۔ اس موافقت کے لیے کسرو اِنکسار ناگزیر ہے اور یہ کسرو اِنکسار صرف معتدل مزاج کے لوگوں ہی میں ہو سکتا ہے' جن کے خیالات بھی متوازن ہوں اور طبیعتیں بھی۔ متوازن غیر متوازن لوگ جمع بھی ہو جائیں تو زیادہ دیر تک جمع رہ نہیں سکتے۔ ان کی جمعیت پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی' اور جن ٹکڑیوں میں تقسیم ہو کر ایک ایک قسم کے عدم توازن کے مریض جمع ہوں گے ان میں پھر تفرقہ رونما ہو گا' یہاں تک کہ آخر کار ایک ایک امام مقتدیوں کے بغیر ہی کھڑا نظر آئے گا۔

جن لوگوں کو اسلام کے لیے کام کرنا ہو اور جنھیں جمع کرنے والی چیز اسلامی اصول پر نظام زندگی کی اصلاح و تعمیر کرنے کا جذبہ اور ولولہ ہو' انھیں اپنا محاسبہ کر کے اس بے اعتدالی کی ہر شکل سے خود بھی بچنا چاہیے' اور ان کی جماعت کو بھی یہ فکر ہونی چاہیے کہ اس کے دائرے میں یہ مرض نشوونما نہ پائے۔ اس باب میں کتاب اللہ اور سنت رسول کی وہ ہدایات ان کے پیش نظر رہنی چاہییں جو انتہا پسندی اور شدت سے منع کرتی ہیں۔ قرآن جس چیز کو اہل کتاب کی بنیادی غلطی قرار دیتا ہے وہ غلو فی الدین ہے' (يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ لَا تَغْلُوا۟ فِى دِينِكُمْ)' (المائدہ ۵: ۷۷)

اور اس سے بچنے کی تاکید نبیؐ اپنے متبعین کو ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

ایا کم والغلو فانما ھلک من کان قبلکم بالغلو فی الدین ۔
خبردار! انتہا پسندی میں نہ پڑنا' کیونکہ تم سے پہلے کے لوگ دین میں انتہا پسندی اختیار کر کے ہی تباہ ہوئے ہیں۔

ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک تقریر میں تین بار فرمایا : ھلک المتنطعون' برباد ہو گئے شدت اختیار کرنے والے' مبالغے اور تعمق سے کام لینے والے۔ دعوت محمدیؐ کا امتیازی وصف اس کے لانے والے نے یہ بتایا ہے کہ بعثت بالحنیفتہ السمحتہ' یعنی آپ پچھلی امتوں کے افراط و تفریط کے درمیان وہ حنیفیت لے کر آئے ہیں جس میں وسعت اور معاملات زندگی کے ہر پہلو کی رعایت ہے۔ اس دعوت کے علمبرداروں کو جس طریقے پر کام کرنا چاہیے وہ اس کے داعی اولؐ نے یہ سکھایا ہے۔

یسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا (بخاری و مسلم)
سہولت دو' تنگ نہ کرو' بشارت دو' نفرت نہ دلاؤ۔

انما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین (بخاری)
تم سہولت دینے کے لیے بھیجے گئے ہو' تنگ کرنے کے لیے نہیں بھیجے گئے۔

ما خیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین قط الا اخذ ایسر ھما مالم یکن اثما (بخاری و مسلم)

کبھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم دو معاملوں میں سے ایک کے اختیار کرنے کا موقع دیا گیا ہو اور آپؐ نے ان میں سے آسان ترین کو نہ اختیار کیا ہو' الا یہ کہ وہ گناہ ہو۔

ان اللہ رفیق یحب الرفق فی الامر کلہ (بخاری و مسلم)
اللہ نرم خو ہے۔ ہر معاملے میں نرم رویے کو پسند کرتا ہے۔

من یحرم الرفق یحرم الخیر کلہ (مسلم)
جو نرم خوئی سے محروم ہوا وہ بھلائی سے بالکل محروم ہو گیا۔

ان اللہ رفیق یحب الرفق و یعطی علی الرفق مالا یعطی علی العنف و مالا یعطی علی ما سواہ (مسلم)

اللہ نرم خو ہے اور نرم خو آدمی کو پسند کرتا ہے' وہ نرمی پر وہ کچھ عطا کرتا ہے جو شدت پر اور کسی دوسرے رویے پر عطا نہیں کرتا۔

ان جامع ہدایات کو ملحوظ رکھنے کے ساتھ' اسلامی نظام زندگی کے لیے کام کرنے والے لوگ اگر قرآن و سنت سے اپنے مطلب کی چیزیں چھانٹنے کے بجائے اپنے مزاج اور نقطۂ نظر کو ان کے مطابق ڈھالنے کی عادت ڈالیں' تو ان کے اندر آپ سے آپ وہ توازن اور توسط و اعتدال پیدا ہوتا چلا جائے گا جو دنیا کے حالات و معاملات کو قرآن و سنت کے دیئے ہوئے نقشے پر درست کرنے کے لیے درکار ہے۔

## تنگ دلی

بے اعتدالی مزاج سے ملتی جلتی ایک اور کمزوری بھی انسان میں ہوتی ہے جسے تنگ دلی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے' جسے قرآن میں "شحِ نفس" سے تعبیر کیا گیا ہے' جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ فلاح اس شخص کے لیے ہے جو اس سے بچ گیا' (وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ التغابن ۶۴ : ۱۶)' اور جسے قرآن تقویٰ اور احسان کے برعکس ایک غلط میلان قرار دیتا ہے۔ (وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ۔ النساء ۴ : ۱۲۸)

اس مرض میں جو شخص مبتلا ہو' وہ اپنی زندگی کے ماحول میں دوسروں کے لیے کم ہی گنجایش چھوڑنا چاہتا ہے۔ وہ خود جتنا بھی پھیل جائے' اپنی جگہ اسے تنگ ہی نظر آتی ہے' اور دوسرے جس قدر بھی اس کے لیے سکڑ جائیں' اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ بہت پھیلے ہوئے ہیں۔ اپنے لیے وہ ہر رعایت چاہتا ہے' مگر دوسروں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کر سکتا۔ اپنی خوبیاں اس کے نزدیک ایک صفت ہوتی ہیں' اور دوسروں کی خوبیاں محض ایک اتفاقی حادثہ۔ اپنے عیوب اس کی نگاہ میں قابل معافی ہوتے ہیں' مگر دوسروں کا کوئی عیب وہ معاف نہیں کر سکتا۔ اپنی مشکلات کو تو وہ مشکلات سمجھتا ہے' مگر دوسروں کی مشکلات اس کی رائے میں محض بہانہ ہوتی ہیں۔ اپنی کمزوریوں کے لیے جو الاؤنس وہ خود چاہتا ہے' دوسروں کو وہ الاؤنس دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ دوسروں کی مجبوریوں کی پروا کیے بغیر وہ ان سے انتہائی مطالبات کرتا ہے جو خود اپنی مجبوری کی صورت میں وہ کبھی پورے نہ کرے۔ اپنی پسند اور اپنا ذوق وہ دوسروں پر ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے' مگر دوسروں کی پسند اور ان کے ذوق کا لحاظ کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ یہ چیز ترقی کرتی ہے تو آگے چل کر خوردہ گیری و عیب چینی کی شکل اختیار کرتی ہے۔ دوسروں کی ذرا ذرا سی باتوں پر آدمی گرفت کرنے لگتا ہے اور پھر جوابی عیب چینی پر بلبلا اٹھتا ہے۔

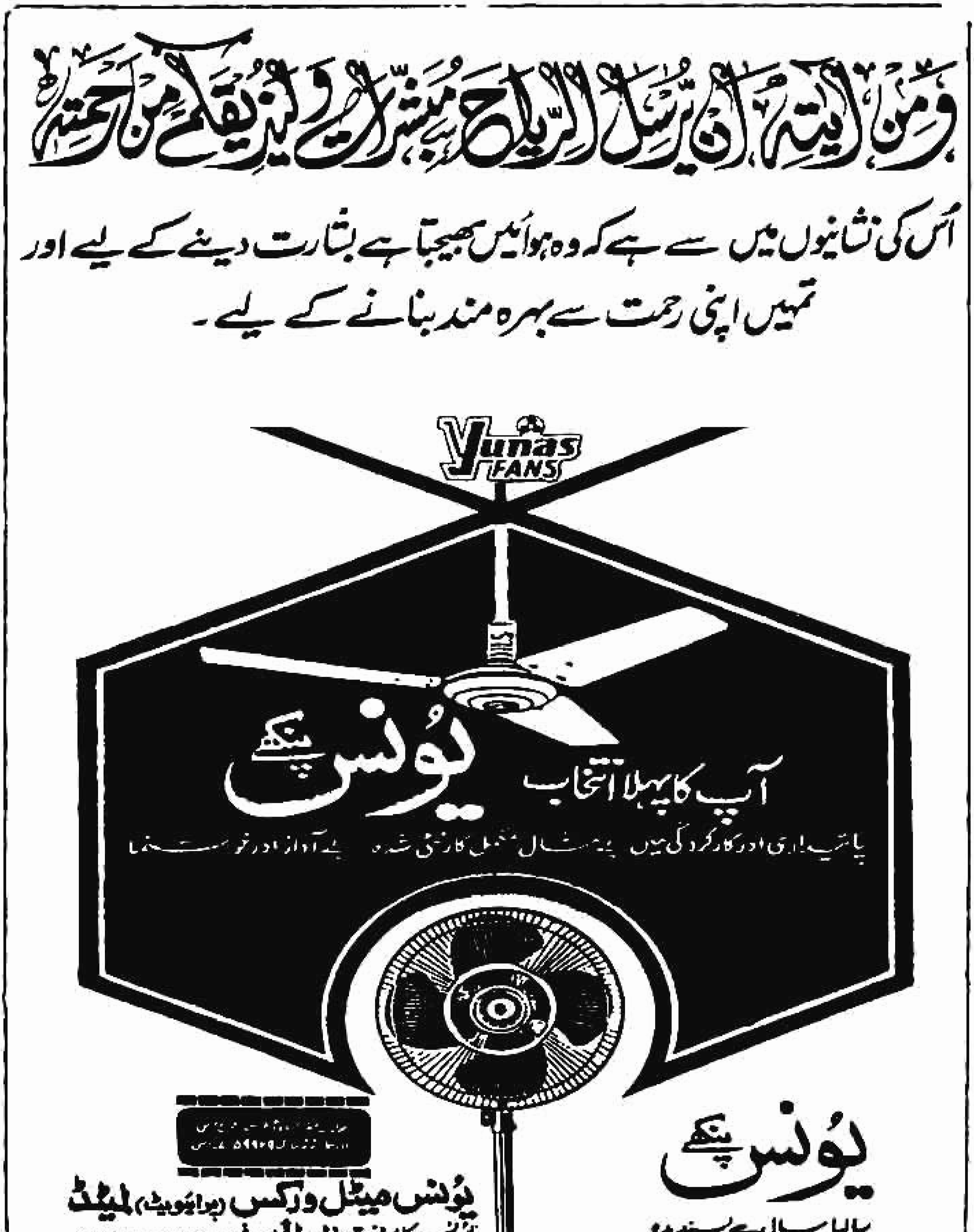
اسی تنگ دلی کی ایک اور شکل زود رنجی، تنک چڑھا پن اور ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنا ہے، جو اجتماعی زندگی میں اس شخص کے لیے بھی مصیبت ہے جو اس میں مبتلا ہو اور ان لوگوں کے لیے بھی مصیبت جنھیں ایسے شخص سے واسطہ پڑے۔

کسی جماعت کے اندر اس بیماری کا گھس آنا حقیقت میں ایک خطرے کی علامت ہے۔ اجتماعی جدوجہد بہرحال آپس کی الفت اور باہمی تعاون چاہتی ہے، جس کے بغیر چار آدمی مل کر بھی کام نہیں کر سکتے۔ مگر یہ تنگ دلی اس کے امکانات کو کم ہی نہیں، بسا اوقات ختم کر دیتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ تعلقات کی تلخی اور باہمی منافرت ہے۔ یہ دلوں کو پھاڑ دینے والی، اور ساتھیوں کو آپس میں الجھا دینے والی چیز ہے۔ اس مرض میں جو لوگ مبتلا ہوں، وہ عام معاشرتی زندگی کے لیے بھی موزوں نہیں ہو سکتے، کجا کہ کسی مقصدِ عظیم کی خدمت کے لیے موزوں قرار پا سکیں۔

خصوصیت کے ساتھ یہ صفت ان صفات کے بالکل ہی برعکس ہے جو اسلامی نظامِ زندگی کے قیام کی جدوجہد کے لیے مطلوب ہیں۔ وہ تنگ دلی کے بجائے فراخ دلی، بخل کے بجائے فیاضی، گرفت کے بجائے عفو و درگزر، اور سخت گیری کے بجائے مراعات چاہتا ہے۔ اس کے لیے حلیم اور متحمل لوگ درکار ہیں۔ اس کا بیڑا وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو بڑا ظرف رکھتے ہوں، جن کی سختی اپنے لیے اور نرمی دوسروں کے لیے ہو، جو خود کم سے کم الاؤنس چاہیں، اور دوسروں کو زیادہ سے زیادہ الاؤنس دیں، جو اپنے عیوب اور دوسروں کی خوبیوں پر نگاہ رکھیں، جو تکلیف دینے کے بجائے تکلیف سہنے کے خوگر ہوں، اور چلتوں کو گرانے کے بجائے گرتوں کو تھامنے کا بل بوتا رکھتے ہوں۔

جو جماعت ایسے لوگوں پر مشتمل ہو گی، وہ نہ صرف خود آپس میں مضبوطی کے ساتھ جڑی رہے گی، بلکہ اپنے گردو پیش کے معاشرے میں بھی بکھرے ہوئے اجزا کو سمیٹتی اور اپنے ساتھ جوڑتی چلی جائے گی۔ اس کے برعکس تنگ دل اور کم ظرف لوگوں کا مجمع خود بھی بکھرے گا، اور باہر بھی، جس سے اس کو سابقہ پیش آئے گا، اسے نفرت دِلا کر اپنے سے دُور بھگا دے گا۔

(سید ابوالاعلیٰ مودودی: تحریک اسلامی کی کامیابی کی شرائط ص ۶۲-۶۷)


وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیٰحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِیُذِیْقَکُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ
اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے بشارت دینے کے لیے اور
تمہیں اپنی رحمت سے بہرہ مند بنانے کے لیے۔
Yunas FANS
یونس پنکھے
آپ کا پہلا انتخاب
پائیداری اور کارکردگی میں بے مثال مکمل کارنٹی شدہ بے آواز اور خوبصورت
یونس میٹل ورکس (پرائیویٹ) لمیٹڈ
یونس کالونی جی ٹی روڈ گجرات فون ۳۱۵۲۵۳۳-۵۲۵۲
فیکس نمبر: ۹۲-۴۳۳۱-۵۲۱۳۲۷
ٹیلکس نمبر 4590 YUNAS PK
گرام "یونس فینز"
یونس پنکھے
سالہا سال سے پسندیدہ
تربیت یافتہ تیکنیکی ماہرین کی
شب و روز محنت کا نتیجہ

# کلام نبویؐ کی صحبت میں

○

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قوی مومن اللہ کو ضعیف مومن سے زیادہ پیارا ہے، اگرچہ ہر ایک میں خیر ہے۔ جو چیز تمھیں نفع دے اس ہی کا لالچ کرو، اور اللہ سے مدد چاہو، اور ہمت نہ ہارو۔ اگر تمھیں کوئی تکلیف، مصیبت یا مشکل پیش آجائے، تو یوں مت کہو کہ "اگر میں ایسا کرتا تو یوں ہو جاتا (یا نہ ہوتا)" بلکہ یوں کہا کرو کہ "اللہ نے ہر چیز کو مقدّر کیا ہے، جو اس نے چاہا وہ کرڈالا"۔ اس لیے کہ تو یعنی "اگر" شیطان کے عمل کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

قوی مومن وہ ہے جو ہمت اور عزم کے اعتبار سے مضبوط ہے۔ اس کے برعکس ضعیف مومن وہ ہے جو ذرا سی مصیبت، مشکل یا ناکامی سے ہمت ہار دیتا ہے۔ اللہ کو عزم و ہمت کی پختگی محبوب ہے۔

اصل نفع وہی ہے جو اللہ کے پاس ہے، اس کی حرص ہی دراصل مطلوب ہے۔ دنیا کا نفع بھی، اگر مقاصد دینی کے لیے ہو، تو مطلوب ہے۔ حرص کے معنی دل کی لگن، شدید آرزو اور کمال سعی کے ہیں۔ دین اور آخرت کی طلب و سعی میں اللہ کو اپنا مددگار بناؤ اور ہمت سے کام کرتے رہو۔

مشکل، مصیبت اور ناکامی کی صورت میں کفِ افسوس مل کر یہ کہنے کا حاصل کہ "اگر میں ایسا کرتا یا نہ کرتا، تو یہ پیش نہ آتا" سوائے حسرت کے کچھ نہیں۔ یہ شیطانی عمل ہے، کہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گویا میرے چاہنے اور کرنے سے وہ کچھ بھی ہونا ممکن تھا جو اللہ نے مقدّر نہ کیا تھا۔

مشکل اور مصیبت کی دعاؤں میں یہ فقرے بار بار آتے ہیں: ما شاء اللہ کان و ما لم یشاء لم یکن - ان اللہ علی کل شی قدیر - ان اللہ قد احاط بکل شئ علما۔ جو اللہ چاہے گا وہی ہو گا، جو اس نے نہیں چاہا، نہیں ہوا۔ بے شک اللہ کو ہر چیز کی قدرت ہے۔ بے شک اللہ کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔

○

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لذتوں کو زائل کر دینے والی کو، یعنی موت کو بہت یاد کرو۔ (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے تم کو زیارتِ قبور سے منع کیا تھا۔ اب تم قبروں کی زیارت کیا کرو، کیونکہ زیارتِ قبور دنیا سے بے رغبتی پیدا کرتی ہے اور آخرت کی یاد تازہ کرتی ہے۔ (ابن ماجہ)

موت دنیا سے روانگی ہے، جس سے کسی کو کوئی مفر نہیں۔ زندگی کا اصل انجام وہی ہے جو دنیا کے اعمال کے نتیجہ میں آخرت میں ملے گا۔ جس گھڑی دنیا کی ہر وہ چیز جس کے پیچھے ہم پڑے ہوئے ہیں چھوٹ جائے گی، جس کے بعد نہ واپسی ہے نہ عمل کی مہلت، اور اللہ سے ملاقات کا وقت آجائے گا، جب صرف حساب ہے اور جزا و سزا ـــــ اس گھڑی کو زیادہ سے زیادہ یاد رکھنا ہی دل کی زندگی اور صفائی و روشنی کا نسخہ ہے۔ یہی صراطِ مستقیم پر قائم رکھنے والی چیز ہے۔ اس کو یاد رکھنے کے لیے ہر ممکن تدبیر کرو، یہاں تک کہ قبرستان جانا بھی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا:
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے عمل ختم ہو جاتے ہیں، مگر تین قسم کے عمل جاری رہتے ہیں: ۱ - ایسا صدقہ جس کا نفع جاری رہے (اور لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں)۔ ۲ - ایسا علم جس سے فائدہ اٹھایا جاتا رہے۔ ۳ - ایسی اولاد جو صالح ہو اور اس کے لیے دعا کرتی رہے۔

انسان سرمایہ کاری وہاں کرتا ہے جہاں نفع زیادہ ہوتا ہو۔ دنیا میں اصل سرمایہ وقت اور عمل ہے۔ اس سرمایہ کاری کے لیے سب سے زیادہ نفع بخش کاروبار کے تین مواقع ہمارے سامنے رکھ دیے گئے ہیں۔ مال کسی ایسے کام میں خرچ کریں جس سے موت کے بعد بھی لوگوں کو نفع پہنچتا رہے۔ دینی، اخلاقی، روحانی، مادی، معاشی نفع۔ سب سے نفع بخش کاروبار دعوت و اصلاح کا کاروبار ہے۔ اپنی نیکیاں موت کے ساتھ ختم ہو جائیں گی، دعوت و اصلاح کے ذریعہ جو نیکیاں کریں گے ان کا اجر اس وقت تک ملتا رہے گا جب تک وہ ہوتی رہیں گی، اور ان لوگوں کی سب نیکیوں کا اجر بھی جو وہ کریں۔ ذرا اس بے حد و حساب اجر کا تصور کیجیے، اور اپنی کوتاہی پر ماتم ۔ ہر علم جو نفع دے، اس کا نفع جاری رہے گا، لیکن جو دوسروں کے لیے آخرت کے نفع کا سامان کرے، اس کی کیا حد اور حساب۔ اور اولاد کو صالح بنائیں، تو نسلاً بعد نسلٍ ان کے عمل صالح کا بھی۔

○

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ مسلمان جو لوگوں سے میل جول رکھتا ہے اور ان کی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں پر صبر کرتا ہے' اس مسلمان سے افضل ہے جو لوگوں سے بے تعلق ہو جاتا ہے اور ان کی تکلیفوں پر صبر نہیں کرتا۔ (ترمذی)

جہاں انسان رہتے ہوں گے' وہاں ایک دوسرے کی گفتگوؤں' رَوِش' اور برتاؤ سے ایذا اور تکلیف لازماً پہنچے گی۔ مایوسیاں ہوں گی' شکایتیں اور گلے بھی ہوں گے' دل بھی خراب ہوں گے۔ اس سے مَفر نہیں۔ افضلیت کی بشارت اُس کے لیے ہے جو ان تمام تکلیفوں اور ایذاؤں پر صبر کرے' اور لوگوں سے میل جول قائم رکھے۔

○

حضرت عبداللہ بن عباسؓ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

ہم جاہلیت کے زمانہ میں بہت سی چیزیں کھا لیا کرتے تھے' بہت سی چیزیں گھن کرتے ہوئے چھوڑ دیا کرتے تھے۔ پھر اللہ نے اپنے نبیؐ کو بھیجا' اپنی کتاب اتاری' حلال کو حلال ٹھہرایا' اور حرام کو حرام قرار دیا۔ پس جو آپؐ نے حلال کیا' بس وہی حلال ہے۔ اور جو آپؐ نے حرام کیا' بس وہی حرام ہے۔ اور جس چیز کے بارہ میں آپؐ نے خاموشی اختیار کی' اس میں چھوٹ ہے (ان کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں)۔ (ابو داؤد)

حضرت ابو ثعلبہ الخشنی جرثوم بن ناشر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض عائد کیے ہیں' انھیں ضائع نہ کرو۔ کچھ حدود مقرر کر دی ہیں' ان سے باہر نہ نکلو۔ کچھ چیزوں کو حرام کر دیا ہے' ان کی حرمت کو پامال نہ کرو۔ اور کچھ چیزوں کے بارہ میں اس نے تمہارے لیے رحمت کی خاطر خاموشی اختیار کی ہے ---- نہ یہ کہ وہ بھول گیا۔ پس ان کے بارہ میں پوچھ گچھ اور چھان بین نہ کرو۔ (دار قطنی)

حرام و حلال قرار دینے کا اختیار صرف اللہ کو ہے' وہی حاکم حقیقی ہے۔ اس کا نبی' اس کا نمائندہ ہے' اس کو بھی اس نے تحریم و تحلیل کا اختیار دیا ہے' اور فرمایا ہے: جس نے رسولؐ کی اطاعت کی' اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ ان کے علاوہ تحریم و تحلیل کا اختیار کسی کو بھی حاصل نہیں' نہ کسی عالم کو نہ کسی راہب کو۔

# کیا ؟

## آپ کے بچے

## خون کی کمی کا شکار ہیں

شکریہ ادا کرنا
نیکی کے درخت کو پانی دینا ہے
تاکہ وہ زیادہ پھل لائے

والدین کو یہ حقیقت یاد رکھنا چاہیے کہ ان کے بچوں کو جو صحت مند خون درکار ہے' وہ ان کی تعریف کرنا ہے' جس میں حوصلہ افزائی کا عنصر بھی شامل ہونا چاہیے۔

انہیں اس نعمت سے محروم نہ رکھیے!
وہ اس طرح خون کی کمی کا شکار ہو سکتے ہیں!!

اگر ہم تعریف جان دار الفاظ میں کسی قدر زور سے کریں اور تنقید کرتے وقت اپنی آواز کم رکھیں تو ہمارے معاشرے میں محبت اور حوصلہ افزائی کا خون گردش کرنے لگے گا۔

(رہنمائے تربیت' ص ۴۳۷)

(یہی تحریکی ذمہ داروں کے لیے بھی ہے!)

خیر خواہ

# ایمان کی حقیقت

## تصدیق بالقلب

مولانا بدرعالم میرٹھیؒ

تصدق قلبی کو ایمان کا وجودِ ذہنی کہا جاتا ہے۔ یہ تصدیق مختلف صورتوں میں پائی جاتی ہے:

۱۔ کبھی دلائل و براہین کا قاہرانہ تسلط یقین کرنے کے لیے مجبور کردیتا ہے۔

۲۔ کبھی انسان از خود دلائل و براہین کا دروازہ جھانک کر علم یقین تک رسائی حاصل کرلیتا ہے۔

۳۔ کبھی بلا وسائل و اسباب بداہتہً یقین میسر آجاتا ہے۔

۴۔ کبھی نہ دلائل کا شعور ہوتا ہے، نہ اور کوئی فطری احساس، صرف تقلیدی طور پر ایک اذعان پیدا ہو جاتا ہے۔

۵۔ کبھی شمشیر کی جھنکار حجابِ غفلت اٹھا دیتی ہے اور صداقت اسلام کا عکس پڑنے لگتا ہے۔

۶۔ کبھی جان و آبرو کی حفاظت کی طمع قلب کو تصدیق کرنے کے لیے ابھار دیتی ہے۔

### تصدیق اور التزام اطاعت

ان سب صورتوں میں گو اختیاری یا اضطراری طور پر تصدیق تو حاصل ہو جاتی ہے مگر ایمان کا وجود ذہنی، اس وقت پھر بھی نہیں ہوتا جب کہ قلب اقرار، وفاداری اور عہد فرمانبرداری نہ کرے۔ اسی کا نام انقیادِ باطن ہے۔ یہ علم نہیں، ایک عملِ قلب ہے اور اختیاری ہے۔ اسی لیے اس پر جزا و سزا مرتب ہے۔ اسی کو عقدِ قلبی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

فقہا کی عبارات میں ضروری ہے کہ تصدیق سے اسی خاص نوع کا ارادہ کیا جائے یا اقرار سے مراد التزام طاعت لیا جائے' ورنہ تصدیق و اقرار کے دو لفظ مل کر بھی ایمان کا پورا مفہوم شرعی ادا کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ حافظ تیمیہؒ نے اپنی کتاب الایمان میں اس جز پر بہت زور دیا ہے۔ یہاں اعتراضات عام طور پر سینوں میں کھٹک رہے ہیں اور بہت سے قلم جواب کے لیے جنبش کرتے نظر آتے ہیں مگر تشفی بخش جواب صرف حافظ ابنِ تیمیہؒ کا ہے۔

انسان ایک ضعیف مخلوق ہے۔ کبھی ایسی جسارت کرلیتا ہے کہ تصدیق اس کو حاصل ہوتی ہے مگر اقرار نہیں کرتا۔ کبھی اس سے بڑھ کر یہ غضب ڈھاتا ہے کہ دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار بھی کرلیتا ہے' مگر اس کو اپنا عقیدہ بنانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَکْفَرَہٗ (عبس ۸۰ : ۱۷)

انسان مارا جائے' کس قدر ناشکر ہے۔

ہرقل جیسے عالم کتاب کی تصدیق کا حال' اس کے اور ابو سفیان کے مکالمہ سے ظاہر ہے۔ اہل کتاب کی معرفت کا تذکرہ عام طور قرآن کریم نے بڑے وزنی الفاظ میں کیا ہے۔

یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ (البقرہ ۲ : ۱۴۶)

اس رسول کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو۔

مگر بایں ہمہ ان کے کفر میں کسی کو مجال شبہ نہیں ہے --- ابو طالب کی داستانِ جاں نثاری سے کتبِ سِیَر کے صفحات مملو نظر آتے ہیں مگر یہاں بھی جمہور محققین ان کے کفر ہی کی طرف جا رہے ہیں۔

## حضرت ابو طالب کا اسلام:

بعض اہل نظر کا یہ خیال ہے کہ جو بے نظیر جان نثاری جناب ابو طالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ظاہر فرمائی تھی' وہ یقیناً کبھی خالی جا نہیں سکتی۔ اس لیے ان کا رجحان ان کے اسلام کی طرف ہے۔ قائل کے ان جذبات محبت کا ہمیں بہت احترام ہے۔ مگر جن کے احترام کی خاطر یہ سارا احترام ہے' کیا کیجیے خود ان سے اس زبردست دعویٰ کی کوئی صحیح سند نہیں ملتی۔ اعلانِ حق کی ذمہ داری اس موقعہ پر کچھ وضاحت کی متقاضی ہے۔ مگر محل کی نزاکت خاموشی سے گزر جانا چاہتی ہے۔ اس گویائی اور خاموشی کے مابین ایک مصنف کا متحیر قلم جو کچھ لکھ سکتا ہے' وہ صرف اس قدر ہے کہ رب العزت کی بلند بارگاہ ہے جہاں کسی کی عداوت و جان نثاری دونوں سے بے نیازی حاصل ہے۔

زمانہ جاہلیت میں عمر فاروقؓ کی شمشیر ایک بد ترین ارادہ کے لیے بے نیام ہوتی ہے، مگر شانِ بے نیازی ان پر سعادت کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ ادھر جناب ابو طالب کی جاں نثاری دیر سے دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے، مگر شانِ استغنا ر التفات تک نہیں کرتی، اور یہ کہہ کر دروازہ بند کر دیتی ہے کہ فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ (الشوریٰ ۴۲: ۷)

کتبِ احادیث کے مطالعہ کرنے والوں کو حیرت ہے کہ بعینہٖ یہ سوال جب حضرت رسالتؐ سے بہت پہلے کیا جا چکا ہے اور اس کا جواب بھی خود زبان فیض ترجمان سے صادر ہو چکا ہے تو پھر اس کے بعد بھی قیاس آرائی کا کیا کوئی موقعہ باقی رہ جاتا ہے؟

صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ سے دریافت کیا گیا کہ "یا رسول اللہؐ آپؐ نے اپنے چچا کو کیا نفع پہنچایا۔ وہ آپؐ کے لیے ہمیشہ سربکف رہا کرتے تھے۔ آپؐ نے جواب دیا کہ میری وجہ سے ہی ان کے عذاب میں اتنی تخفیف کر دی گئی ہے کہ صرف آگ کے دو جوتے پہنا دیے گئے ہیں، جن کی تیزی سے ان کا دماغ کھول رہا ہے۔ اگر میں نہ ہوتا تو جہنم کے سب سے نیچے طبقے میں ہوتے۔

یہ بحث ابھی نہیں ہے کہ یہ جاں نثاری رسول خداؐ کے لیے تھی یا ایک عم کی اپنے ابن عم کے لیے۔ انصار کی محبت، اس لیے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کی، ایمان کی علامت ہے اور اسی حیثیت سے ان سے بغض، نفاق کی نشانی ہے۔ اگر یہ حیثیت ملحوظ نہ رہے تو نہ وہ ایمان کی علامت ہے اور نہ یہ نفاق کی۔

۔ کتاب الایمان ص ۷۷ ۔ ایضاً ۱۰۶

ان سب امور سے یہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تک تصدیق کے ساتھ التزام طاعت اور انقیادِ قلبی نہ ہو، ایمان حاصل نہیں ہوتا۔ ہرقل اور اس جیسے اور اہلِ کتاب نے تصدیق ضرور کی، اور اقرار بھی کیا، مگر کیا ایک لمحہ کے لیے بھی، اپنا قدیم مذہب ترک کر کے دین محمدی میں قدم رکھا؟ جناب ابو طالب نے جاں نثاری کا جو نقشہ پیش کیا، بلا شبہ وہ رہتی دنیا تک تاریخ کے صفحات کی زینت رہے گا۔ مگر کیا ایک مرتبہ بھی، اس کلمہ کے لیے، ان کی زبان متحرک ہوئی جس کے لیے رسول خداؐ دیر سے اصرار فرما رہے تھے۔

انقیادِ باطن، التزامِ طاعت اور عہدِ وفاداری، یہ وہ اوصاف ہیں جن کے بغیر تصدیق صرف علم ہی کا اک مرتبہ رہتا ہے۔ ایمان کے وجودِ ذہنی کے لیے ضروری ہے کہ یہ علم ایسی صفتِ نفس بن جائے کہ پھر قلب اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے پر مجبور ہو جائے۔ اسی کا نام ہم نے عملِ قلب رکھا ہے۔ بعض ضعیف الاسناد روایات میں ایمان کی تعریف میں "عقد بالقلب" کا لفظ وارد ہے۔ اسی طرح عباراتِ سلف میں بھی یہ لفظ پایا جاتا ہے۔ ہمارے

نزدیک اس کی مراد بھی یہی عملِ قلب ہے۔

خلاصہ یہ کہ ایمان صرف تصدیق نہیں ہے' بلکہ انقیاد قلبی اور التزام بھی اس کا اہم جز ہے۔ اگر ایک شخص صرف تصدیق رکھتا ہے مگر عہدِ وفاداری نہیں کرتا' وہ مومن نہیں کہلا سکتا۔ اسی طرح اگر فرمانبرداری کے لیے تو آمادہ ہے' مگر قلب و زبان سے تصدیق کے لیے آمادہ نہیں' تو بھی وہ مومن نہیں ہے۔ ایمان صرف اس صورت کا نام ہے کہ قلب و زبان تصدیق سے مزیّن ہوں' اور شریعت پر عمل پیرا ہونے کا عزم بھی مصمم ہو۔ گویا شرعی تصدیق اسی کا نام ہے۔

## تصدیق کا حقیقی مفہوم

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ" فرماتے ہیں کہ قرآن و حدیث کے جو الفاظ خود شارع علیہ السلام کے بیان اور محل استعمالات سے کسی معنی کے لیے متعین ہو چکے ہیں' بس وہی اس کے صحیح معنی ہوں گے۔ لغت میں عموم یا خصوص اس کے معنی پر کچھ اثر انداز نہ ہو گا۔ ایک متکلم جب اپنے بار بار کے استعمال سے ایک لفظ کے معنی خود متعین کر دیتا ہے تو پھر کسی کو حق نہیں رہتا کہ لغت کی مدد یا دیگر شواہد سے اس کے کلام میں کوئی دوسرے معنی مراد لے۔ مثلاً یہی ایمان کا لفظ لے لیجیے۔ لغت میں یہ لفظ تصدیق کے لیے موضوع ہے مگر شارع علیہ السلام نے اس لفظ کو جب بھی استعمال کیا ہے' ایک خاص نوع کی تصدیق کے لیے ہی استعمال کیا ہے۔ اس لیے اب احادیث میں اس لفظ سے وہی تصدیق مراد لی جائے گی' جو اس کے مکرر سہ کرر بیانات سے متعین ہو چکی ہے۔ فرض کرو' ایک شخص دربارِ نبوت میں حاضر ہوتا ہے اور تصدیق کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ میں' نہ آپ کے احکام بجا لاؤں گا' نہ جس چیز سے آپ منع فرمائیں گے باز رہوں گا' نہ فرائض خمسہ ادا کروں گا۔ ہاں' شراب پیوں گا' چوری' زنا' نکاح محارم کروں گا۔ غرض جو نا کردنی ہے وہ سب کچھ کروں گا۔ کیا ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی شخص یہ تصور کر سکتا ہے کہ محض لغوی تصدیق کے بعد رسول خدا اس کے لیے ایمان کا پروانہ تحریر فرما دیں گے' اس کی شفاعت کا وعدہ فرمالیں گے اور جہنم سے نجات ابدی کی بشارت سنا دیں گے۔ یا یہ جواب دیں گے کہ تو صرف کافر نہیں بلکہ بدترین کافر ہے۔ تیرا یہ ایمان' ایمان نہیں' استہزا ہے۔ یہ تصدیق نہیں' بلکہ تکذیب کا بدترین مظاہرہ ہے اور اگر یہ بھی ایمان ہے تو پھر ابلیس کے ایمان میں کیا کسر تھی' جس نے صرف ایک ہی سجدہ کا تو انکار کیا تھا۔ پھر قرآن نے کیوں اس کو کافروں میں شمار کر لیا ہے۔ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ (البقرہ ۲:۳۴)

حضرت استاد مولانا انور شاہ کشمیریؒ فرماتے تھے کہ ایمان کا ترجمہ جاننا' یا یقین کرنا' یا تصدیق کرنا اچھا نہیں ہے۔ ان تراجم سے ایمان کی پوری حقیقت واضح نہیں ہوتی۔ صحیح ترجمہ "ماننا" ہے جس سے التزامِ طاعت کا مفہوم بھی ادا ہو جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

اتنی ہی تو بس کسر ہے تم میں کہنا نہیں مانتے کسی کا

اردو داں حضرات کو حضرت استاد کا ایک ترجمہ ہماری اس ساری تفصیل سے بے نیاز کر سکتا ہے۔ یہ ہے ایمان کا وجودِ ذہنی۔ یہی ایمان کا جزاشرف ہے' نجات ابدی اسی پر منحصر ہے اور آخرت کی ساری خوشیاں اسی کے ثمرات و برکات ہیں۔

## تصدیق کے باوجود اِنکار

اگر یہ شبہ کیا جائے کہ تصدیق و معرفت حاصل ہونے کے بعد اِنکار و جحُود کیسے ممکن ہے' تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک انسان تکمیل انسانیت سے پہلے انسان نہیں بنتا وہ ہمیشہ خصائل بہیمہ کا محکوم بنا رہتا ہے۔ اس کے علوم و معارف میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے فطری و خلقی جذبات کو شکست دے سکے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی راحت ابدی صرف انبیا کی اطاعت میں منحصر ہے' مگر اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ایمان لانا بہت سے لذائذ و مرغوبات کا ترک کر دینا' اور بہت سے مکروہات میں اپنی جان کو مبتلا کر دینا ہے۔ اس لیے قیدِ ایمان کی لذت سے یہ نا آشنا' اپنے ہاتھ سے اپنے بازوئے آزادی کترتے ہوئے کبھی اتراتا اور کبھی کتراتا ہے۔ اِبلیس کے علم و تصدیق کا حال تو مشہور ہی ہے۔ فرعون کی تصدیق کا حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی سن لو۔

لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ (بنی اسرائیل ۱۷: ۱۰۲)

آپ جان چکے ہیں کہ یہ چیزیں کسی نے نہیں اتاریں مگر آسمان و زمین کے مالک نے' سمجھانے کے واسطے۔

معلوم ہوا کہ فرعون جیسا شقی بھی نزولِ آیات کے منشا کا صحیح علم رکھتا تھا' مگر اس کے بعد بھی جو کفر اس نے کیا ہے کیا دنیا میں ضرب المثل نہیں؟ اس کی وجہ بے علمی تھی؟ یا سارے جہان پر اس کا علو و برتری کا جنوں۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا (القصص ۲۸: ۴)

فرعون ملک میں بڑائی کر رہا تھا اور وہاں کے لوگوں کو پارٹیاں بنا رکھا تھا۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (النازعات ۷۹: ۱۷)

فرعون کی طرف جاؤ اس نے بہت سر اٹھایا ہے۔

اکثر کفار اسی طغیان کے شکار تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جو بکواس انھوں نے نبیؐ وقت کے بالمقابل کبھی کی ہے' اس میں ایک حرف بھی ایسا پیش نہیں کیا جس کو ایک صحیح الدماغ انسان ایک منٹ کے لیے نبوت کے منافی سمجھ سکتا ہو۔ صرف اپنے حسد و بغض کا مظاہرہ کیا ہے اور بس۔ معلوم ہوا کہ اپنی جگہ ان کی نبوتوں میں کفار کو بھی شبہ نہ تھا' ورنہ کبھی ایک دلیل تو ایسی بیان کرتے جو ان کفر یا تردد کی کچھ تو پردہ پوشی کر لیتی۔ آیات ذیل کا بغور ملاحظہ کرو اور فیصلہ کرو۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کہتی ہے۔

اَنُؤْمِنُ لَکَ وَاتَّبَعَکَ الْاَرْذَلُوْنَ (الشعراء ۲۶: ۱۱۱)

کیا ہم تیری فرمانبرداری کریں حالانکہ تیری پیروی تو ذلیل لوگوں نے کی ہے۔

کیا اتباع ارذلین بھی صدقِ نبی کے منافی ہے یا کذبِ نبی کی کوئی دلیل بن سکتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ بات یہ تھی کہ متکبر اور مغرور انسان کبھی یہ پسند نہیں کر سکتا کہ ایک کمزور اور ذلیل انسان کو اپنے برابر یا اپنے نفس کو اس کے پہلو بہ پہلو' دیکھ سکے' اور یہ وہ خوب جانتا ہے کہ اسلام اس کے اس فاسد جذبہ کو' ہرگز پورا نہیں کر سکتا۔ وہ اس فرق کو اٹھا دینے کے لیے آیا ہے۔ یہی تو وجہ تھی کہ مشرکین عرب نے بھی سرور کائنات ؐ کے سامنے یہ درخواست پیش کی کہ سعد بن ابی وقاص' ابن مسعود' خباب بن الارت' عمار بن یاسر' بلال رضی اللہ تعالٰی عنہم اور ان جیسے اور غربا کو اپنی محفل سے نکال دیجیے تاکہ ہمارے آنے جانے کی جگہ ہو جائے۔ اس پر قرآن کریم نے جو جواب دیا' وہ یہ تھا۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ مَا عَلَیْکَ مِنْ حِسَابِھِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِکَ عَلَیْھِمْ مِّنْ شَیْءٍ فَتَطْرُدَھُمْ فَتَکُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ○ وَکَذٰلِکَ فَتَنَّا بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لِّیَقُوْلُوْٓا اَھٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنْۢ بَیْنِنَا اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰکِرِیْنَ ○ (الانعام ۶: ۵۲-۵۳)

اور مت دور کیجیے ان لوگوں جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح اور شام' چاہتے ہیں اس کی رضا آپ پر' ان کے حساب میں کچھ نہیں ہے اور نہ آپ کے حساب میں ہی ان پر کچھ ہے کہ آپ ان کو دور کرنے لگیں تو بے انصافوں میں ہو جائیں۔ اور اسی طرح ہم نے آزمایا ہے بعضے لوگوں کو بعضوں سے' تاکہ کہیں' کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے فضل کیا ہم سب میں۔ کیا اللہ تعالٰی شکر کرنے والوں کو خوب جاننے والا نہیں ہے۔

### حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کا مغرورانہ جواب

أَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُونَ ○ (المومنون ۲۳ : ۴۷)

کیا ہم ایمان لائیں ایسے دو آدمیوں پر جو ہم جیسے ہیں' اور ان کی قوم ہماری تابعدار ہے۔

أَلَمْ نُرَبِّكَ فِينَا وَلِيدًا وَلَبِثْتَ فِينَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِينَ ○ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِي فَعَلْتَ وَأَنْتَ مِنَ الْكَافِرِينَ (الشعراء ۲۶ : ۱۹)

کیا نہیں پالا ہم نے تجھ کو اپنے یہاں لڑکا سا' اور رہا تو ہم میں اپنی عمر میں سے کئی برس۔

### حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کی متمردانہ تقریر

أَصَلَوٰتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَنْ نَفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ (ھود ۱۱ : ۸۷)

کیا تجھے تیری نماز اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم ان بتوں کی عبادت ترک کر دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادے کیا کرتے تھے' یا اپنے مال میں جس طرح چاہیں تصرف کریں۔

### مشرکینِ عرب کا ایک لغو اعتراض

لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ ○ (زخرف ۴۳ - ۳۱)

یہ قرآن ان دو بستیوں کے کسی شخص پر کیوں نہ اتارا گیا۔

ان بیانات کو پڑھ کر کیا آپ نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان کفار کو سچ مچ' ان انبیا کے متعلق' کوئی شبہ درپیش تھا۔ کیا ان بیانات میں ان کے صدق و کذب پر کوئی بحث ہے' یا محض اپنے حسد و بغض کی ترجمانی ہے۔

### مشرکینِ عرب کا ایک بے معنی عذر

إِنْ نَتَّبِعِ الْهُدَىٰ مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ أَرْضِنَا (القصص ۲۸ : ۵۷)

اگر ہم راہ پر آجائیں تیرے ساتھ' تو اچک لیے جائیں اپنے ملک سے۔

دوسری جگہ کہتے ہیں۔

إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِمْ مُهْتَدُونَ ○ (زخرف ۴۳ : ۲۲)

ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک راہ پر پایا اور اب ہم انھی کے مقتدی رہیں گے۔

کیا یہ ہیں وہ دلائل جو کسی رسول کی صداقت کے منافی ہو سکتے ہیں۔

حافظ ابن تیمیہ" یہ سب کچھ لکھ کر فرماتے ہیں کہ جناب ابو طالب کی محرومی کا باعث ان باتوں میں سے کوئی بات نہ تھی- وہ تو بدل و جان آپ کے لائے ہوئے دین کی برتری کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے- مگر تقدید یہاں دوسرے راستہ سے آئی- یعنی آبائی دین کے ترک پر قریش کا طعنہ ان سے برداشت نہ ہو سکا- تصدیق موجود ہے' معرفت تامہ حاصل ہے' قدم قدم پر جاں نثاری ہو رہی ہے- یہ سب کچھ ہے' مگر التزام طاعت کا ابھی ارادہ نہیں ہے- کیوں؟ تقدیر' عصبیتِ جاہلیت' قومی غیرت اور مذہبی جمود کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور آغوش اسلام میں آنے نہیں دیتے-

ان سب امور کے سوا ذلیل طبع افراد کے سامنے کبھی معمولی سے نفع و ضرر کا سوال بھی آجاتا ہے- اس لیے مقتضائے تصدیق پورا نہیں ہوتا-

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ- (مائدہ ۵: ۵۲)

آپ دیکھیے گا ان کو جن کے دل میں بیماری ہے- ان میں دوڑ کر ملتے ہیں کہتے ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ ہم پر زمانہ کی گردش نہ آجائے' سو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ جلد ہی فتح ظاہر فرما دے یا کوئی حکم اپنے پاس سے بھیجے تو اپنے دل کی (ان) پوشیدہ باتوں پر پچھتانے لگیں-

ان تمام تفاصیل سے یہ ظاہر ہو گیا کہ بسا اوقات تصدیق قلبی میسر آجاتی ہے' مگر انسان کی طبعی غیرت' یا قومی عصبیت و نخوت' یا عزت و مال کی تھوڑی سی طمع' اور اسی قسم کے دوسرے موانع باطنی' انقیاد اور التزام طاعت سے مانع رہتے ہیں- نعوذ باللہ من شر الشیطان و شرکہ-

## تصدیق اور احکامِ شریعت

یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ تصدیق و انقیاد کا دائرہ صرف ذات و صفات کے مسائل یا رسالت کی حد تک محدود نہیں ہے' بلکہ رسول کا ہر قول اور ایک ایک اشارہ اس میں شامل ہے' ارشاد باری تعالیٰ ہے-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (بقرہ ۲: ۲۰۸)

اے ایمان والو' داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے-

حضرت مجاہد" اور قتادہ" فرماتے ہیں کہ یہ آیت مسلمانوں کو' شریعت کے ہر ہر جز پر التزامِ طاعت کی' دعوت دیتی ہے' خواہ وہ فرائض ہوں یا مستحبات' واجب علی الکفایہ ہوں

یا علی الاعیان۔ اگر اسلام کے فرائض علی الاعیان ہیں تو اعتقاد فرضیت کے ساتھ ہر ہر شخص پر اس کا ادا کرنا بھی فرض ہو گا' اور اگر واجب علی الکفایہ ہیں تو اس کے وجود کا اعتقاد ضروری ہو گا' اور اگر مستجبات ہیں تو اس کا اعتقاد لازم ہو گا۔ غرض یہ کہ جس چیز کا دین محمدی میں داخل ہونا بداہتہً معلوم ہو چکا ہے' وہ سب ایمانیات میں داخل ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں؟ کیا ایمان' رسولِ خداؐ کی مطلقاً فرمانبرداری کا نام نہیں؟ کیا التزامِ طاعت میں کوئی تفصیل ہے؟ اگر رسولؐ کا فرمان اس لیے واجب العمل ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ہے' جو کہتا ہے وہ حق ہی کہتا ہے' تو پھر انقیاد و تسلیم کا دائرہ اس کے سب اوامر و نواہی پر کیوں محیط نہ ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ زمانہ رسالت میں چونکہ واسطے نہ تھے' ہر بات براہِ راست سنی جاتی اور دریافت کی جاتی تھی اور اگر واسطے تھے بھی تب بھی اس کی تحقیق بلا واسطہ ممکن تھی' اس لیے التزامِ طاعت بلا استثنا لازم تھا۔ لیکن بعد میں سند کا طویل سلسلہ حائل ہو گیا۔ جرح و تعدیل کے بے شمار مباحث نے احادیث میں ضعیف و قوی کی تقسیم پیدا کر دی۔ اس لیے اب یہ بحث قائم ہو گئی کہ کن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے' اور کیا چیزیں ایمانیات میں داخل نہیں۔ جواب اب بھی وہی ہے۔ یعنی جو فرمان رسولؐ ہے اس سب کا ماننا فرض ہے۔ مگر اب اس کا ثبوت کیا ہے کہ یہ بات درحقیقت رسول خداؐ کی فرمودہ بھی ہے۔ اس لیے علما نے یہ فیصلہ کر دیا ہے' کہ جس چیز کا دین محمدی میں ہونا اتنا روشن ہو جائے کہ محتاجِ دلیل نہ رہے' ان سب کا ماننا ایمان کے لیے ضروری ہے اسی کو ضروریاتِ دین کہا جاتا ہے۔ مثلاً فرائضِ خمسہ' زکوٰۃ' حج' روزہ' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبین ہونا' آپ کے بعد کوئی دوسرا نبی نہ ہونا' عذابِ قبر' قیامت' قرآنِ کریم وغیرہ۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جس کے ثبوت میں دلائل کی حاجت نہیں بلکہ کفار بھی ان چیزوں کا دین میں داخل ہونا جانتے پہچانتے ہیں۔ اس لیے اس کا انکار' اسی طرح کفر ہو گا جیسا کہ توحید یا رسالت کا۔

---

# کاش! میں تنکا ہوتا

شیخ محبوب علی

پہلے بھی سوچا اور آج بھی سوچ رہا ہوں۔ تنہائیوں میں بھی سوچا، کبھی کبھار محفلوں میں بھی سوچا۔ کاش میں ایک تنکا ہوتا! اگر میں ایک تنکا ہوتا تو ہواؤں کے دوش پہ اڑتا۔ ہلکا پھلکا، جہانوں کی سیر کرتا، بستی بستی نظارہ کرتا۔ انسان پر انسان کی چیرہ دستیوں، سرمستیوں، خرمستیوں، پستیوں اور بلندیوں کو دیکھتا۔ ستاروں کی طرح دیکھتا اور گزر جاتا۔ اگر میں ایک تنکا ہوتا تو پانی کی موجوں پہ بہتا۔ دریاؤں کی طغیانیوں اور طوفانوں کے ساتھ ہوتا۔ ساحلوں پر آباد انسانوں کی بستیوں کو دیکھتا، متکبر انسانوں کی بربادیوں کو دیکھتا اور دریا کی روانی میں بہتا، سمندروں میں جا نکلتا۔ کنارے سے بے کنار ہوتا، سمندروں کی پنہائیوں میں جاتا، اس کی تہوں میں غوطہ زن ہوتا، رنگ برنگ کی دنیا سے آشنا ہوتا، صدف و گوہر کی دنیا، موتیوں کی دنیا، مچھلیوں کی دنیا۔ سب کچھ دیکھتا اور میرا کچھ نہ ہوتا۔ کاش کہ میں ایک تنکا ہوتا اور اگر میں ایک تنکا ہوتا، تو آغوش زمیں میں ہوتا، جہاں سکون ہوتا، قرار ہوتا، چین ہوتا، اپنی دنیا ہوتی، کسی قسم کی پریشانی نہ ہوتی---

لیکن -----

اگر میں ایک تنکا ہوتا تو ہواؤں کے تھپیڑے کھاتا۔ ہواؤں کا ایک ہلکا سا جھونکا مجھے اس پستی سے اٹھا کر اس پستی میں ڈال دیتا، اس وادی سے اٹھا کر اس وادی میں لا پھینکتا۔ تنکے کی ایک حقیقت ہی کیا ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے! اگر میں ایک تنکا ہوتا تو پانی کی ایک ہلکی سی موج مجھے اٹھا کر چٹانوں سے دے مارتی۔ نہ میری کسی آرزو کا دخل ہوتا، نہ میرے کسی ارادے کا دخل ہوتا، میں بے کس و مجبور ہوتا۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے! اور اگر میں زمین پر پڑا ہوتا تو پاؤں تلے کچلا جاتا، پیسا جاتا، سڑتا اور گلتا رہتا۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے! ایک بے جان تنکا۔ بے کس تنکا۔ مجبور تنکا۔ شکر ہے کہ میں ایک تنکا نہیں۔ میں ایک انسان ہوں، میں اشرف

المخلوقات ہوں۔ یہ شمس و قمر، یہ لوح و قلم، سب میرے ہیں۔ یہ کائنات میرے لیے ہے۔ دریاؤں کی طغیانی و روانی کو چیرتا ہوا میں آگے بڑھتا ہوں۔ میں ایک انسان ہوں، بلند سے بلند پہاڑ میرے عزائم کے آگے رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ میں ایک انسان ہوں، زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود آج میرے قدموں تلے ہے۔ بلاشبہ میں ایک انسان ہوں۔ سورج طلوع ہوتا ہے، تو میرے لیے طلوع ہوتا ہے۔ ہوائیں چلتی ہیں تو میرے لیے چلتی ہیں۔ یہ گرمی اور ٹھنڈک ہے تو میرے لیے ہے۔ یہ زمین جو سونا اگلتی ہے، تو میرے لیے اگلتی ہے۔ میں ایک انسان ہوں۔

لیکن ــــ

میں سوچتا ہوں کہ میں ایک تنہا انسان نہیں۔ میں انسانوں کے ساتھ، انسانوں کی دنیا میں رہتا ہوں۔ انسانوں کے ساتھ میرے تعلقات ہیں، اور ان انسانوں کے ساتھ رہتے ہوئے، میں چاہوں نہ چاہوں، میرے لیے کچھ پابندیاں ہیں، کچھ رکاوٹیں ہیں، کچھ حقوق و فرائض متعین کردیے گئے ہیں۔ پھر میں سوچتا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے جنازے، انسانوں کی قبریں، بہتا ہوا خون، آجاتا ہے۔ یہ سب کچھ آخر کیا ہے؟ مجھے مرنا بھی ہے! میرا حشر، میرا انجام یہ بھی ہونا ہے۔ جب میں یہ سوچتا ہوں تو پھر اسی لمحے خیال آتا ہے کہ 'کاش میں ایک تنکا ہوتا!

میری آنکھوں کے سامنے قبر کچھ اور ہی سوال لے کر آتی ہے۔ کیا ہوتا، اگر میں ایک تنکا ہوتا؟ زیادہ سے زیادہ مٹی میں دفن ہو جاتا، کچلا جاتا، روندا جاتا۔ لیکن اب میرا کیا ہوگا؟ میرے جسم کو قبر کے سانپ اور اژدھے نوچیں گے، کاٹیں گے، میں ان کی غذا بنوں گا۔ قبر کے پتھر، اس کی مٹی آہستہ آہستہ میرے بے جان لاشے پر آکر ڈھیر ہوگی۔ میرے تندرست پاؤں، یہ دھڑکتا ہوا دل، سب کچھ آہستہ آہستہ سڑے گا اور اس سے بدبو اٹھے گی۔ یہ میرا انجام ہونا ہے! میں یہ سوچتا ہوں کہ بات اگر یہیں پہ ختم ہو جاتی تو کچھ نہ ہوتا، وہی حشر ہوتا جو تنکے کا ہوتا۔ لیکن میرے سامنے یہ منظر آتا ہے کہ کچھ فرشتے آکر پوچھیں گے: "تیرا نبی کون تھا؟ تیرا دین کیا تھا؟" میں زبان سے کہوں گا: "ہاں وہ ــــــ وہ ــــــ اللہ۔" اور فرشتے گرز تانے کھڑے ہوں گے۔ "جھوٹ مت بول۔ تو نے کس کی پرستش کی تھی؟ اپنے نفس کی؟ دولت کی؟ انسانوں کی؟" میں کہوں گا: نہیں نہیں ــــــ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرے نبی تھے۔" وہ کہیں گے۔ "کیا تو دنیا میں ان کے کہنے پر چلتا رہا؟" میں کہوں گا: "اسلام میرا دین تھا۔" وہ کہیں گے: "تیری زندگی کے یہ اور یہ حصے تو اسلام سے خالی نظر آتے ہیں۔ نہیں، آج کوئی جھوٹ

نہیں سنا جائے گا۔" میں سوچتا ہوں۔ میں جواب دے سکوں گا یا نہیں دے سکوں گا' میری زبان گنگ تو نہیں ہو جائے گی۔ اس وقت کیا ہوگا !

اس خیال کے آتے ہی میں یہ سوچتا ہوں کہ اپنی زندگی کا نئے سرے سے جائزہ لوں ––– مرنے کے بعد جو سوال ہوں گے' ان کا تقاضا یہ ہے کہ میں یہاں پر اللہ کی بندگی اور غلامی کی زندگی اختیار کروں۔ میری اپنی کوئی خواہش نہ ہو' کوئی پسند نہ ہو' کوئی آرزو نہ ہو' کوئی تمنا نہ ہو' جو اللہ کی پسند کے خلاف ہو۔ اللہ کی رضا کے سوا میرا کوئی مقصد نہ ہو۔ بحیثیت انسان میرا مقام یہی ہے۔ دنیا میں میری آمد کا مقصد یہی ہے۔

میں یہ سوچتا ہوں کہ

ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۝

پھر تم سے نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ (التکاثر)

یہ ہوا' یہ پانی' جو مجھے بلا قیمت ملا تھا' اس کا کیا حساب دوں گا۔ میں طاقت ور و توانا ہوں۔ اپنے ہاتھ پاؤں ہلا سکتا ہوں۔ یہ زبان کس حد تک اللہ کی غلامی میں استعمال ہوئی۔ یہ آنکھ کس حد تک اللہ کی بندگی میں لگی رہی۔ اور مجھے خیال آتا ہے کہ مجھ سے میری رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ جہاں جہاں میرا اثر ہے' جہاں جہاں لوگ میری بات سنتے اور مانتے ہیں' وہ میری رعیت ہیں۔ ان سب کے متعلق مجھ سے سوال ہوگا' پوچھا جائے گا۔

آج کس کی بادشاہت ہے ؟ آج کوئی شخص بلااجازت بول نہ سکے گا۔ فرشتے ہجوم در ہجوم لوگوں کو ہانکتے ہوئے لیے جارہے ہوں گے اور ایک شدید افراتفری کا عالم ہوگا۔ میں سوچتا ہوں کاش مجھے وہاں جنت نصیب ہو جائے۔ مجھے جنت ابھی تو مل سکتی ہے۔ جنت ! میری آرزوؤں کی تکمیل "جنت۔" کیا کیا خواہشیں میرے دل میں آتی رہیں۔ وہ شان و شوکت والے اعلیٰ محل' موتیوں' زمرد سے چمکتے محل' میری آرزو دنیا میں رہے۔ افلاک کی سیر' براق پر سوار ہو کر' برق سے تیز رفتار سواری پر سوار ہو کر' فضاؤں میں گھومنے کی آرزو کا نام' جنت ––––– وہ عورتیں' وہ غلمان' وہ لڑکیاں' بڑی آنکھوں والی' خوبصورت چہروں والی' ہر نوجوان کی' ہر انسان کی آرزو' دل میں تڑپتی ہوئی آرزو' اس کا نام جنت۔ انسان کی ہر خواہش پوری ہو' اس کی تکمیل کا نام' جنت۔ میں سوچتا ہوں یہ جنت کیا مجھے نہیں مل سکتی ؟ کیا اس کا ملنا مشکل ہے ؟ لیکن میں یہ سوچتا ہوں تو میرے سامنے یہ بات آتی ہے :

"کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں قدم رکھ لو گے حتیٰ کہ ہم جان نہ لیں کہ تم

میں سے جہاد کرنے والے اور صبر کرنے والے کون ہیں"۔ (آل عمران)
صبر! اپنے دنیا کے خوابوں سے نکل کر' ان پر قابو پاکر' ان کو ضرورت پڑے تو مسمار کر کے آخرت کے لیے کام کرنا' اپنی آرزوؤں کو بھینٹ چڑھا کر آخرت کے لیے جدوجہد کرنا۔ اپنی خواہشات پر قابو پا کے اللہ کی بندگی و غلامی کو اختیار کیے رکھنا۔ اقامتِ دین کی جدوجہد میں اپنی جان کی بازی لگا دینا اور ہر تکلیف کو برداشت کر لینا۔ یہ صبر' کیا یہ ممکن ہے؟
میں سوچتا ہوں کہ جنت' محنت اور ناخوشگوار باتوں سے گھری ہوئی ہے۔ کیا یہ جنت مجھے مل سکتی ہے؟

پھر میں یہ سوچتا ہوں کہ وہ شخص کون تھا' وہ مقدس ترین انسان' انبیا کے بعد دنیا میں سب سے بڑا انسان' جس نے اللہ کی راہ میں اپنی پوری زندگی قربان کر دی' جس نے اللہ کی راہ میں اپنا گھر کا پورا اثاثہ لاکر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں رکھ دیا؟ وہ انسان ----- جس کے ایمان کی بنا پر اسے صدیقؓ کا خطاب دیا گیا' جب وہ انسان ایک ریگ زار میں اپنی پیشانی رگڑ کر کہتا ہے کہ کاش میں تنکا ہوتا! ------ تو میں یہ سوچتا ہوں کہ جب اتنا بڑا انسان اپنی ساری زندگی کھپا کر یہ کہتا ہے' تو میں کیا اور میری بساط کیا! میں کیا اور میرے اعمال کیا! کیا میری بخشش نہیں ہو سکتی؟ پھر میرے کانوں میں آواز آتی ہے: "اے ایمان لانے والو! بچاؤ اپنے آپ کو' اپنے گھر والوں کو' اس آگ سے جس کا ایندھن' انسان اور پتھر ہوں گے"۔ میں سوچتا ہوں کہ ایک ایسی آگ' ایسا الاؤ جس میں پتھر چیخ رہے ہوں' جس میں انسان کی ہڈیاں گل رہی ہوں' اس آگ سے اس کی چربی پگھل رہی ہو' اس آگ سے' اللہ رب العالمین مجھ سے کہتا ہے: بچاؤ اپنے آپ کو۔ تم ایمان لے آئے ہو تو کیا ہوا' تم اس آگ کا نوالہ بن سکتے ہو' تمہاری چربی اور تمہاری ہڈی بھی اس آگ کو دہکانے والا ایندھن بن سکتی ہے۔
"اس آگ سے بچو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے!"

پھر میں دیکھتا ہوں کہ میں کھڑا ہوں اور الٹے ہاتھ میں میرا نامۂ اعمال دیا جا رہا ہے۔ اے کاش' اے کاش' یہ نامۂ اعمال میرے ہاتھ میں نہ دیا جاتا۔ میں کھڑا دیکھ رہا ہوں کہ میرا مال میرے کسی کام نہ آیا' میری طاقت' میری شان سب غارت ہو گئی۔ میں ہارے ہوئے جواری کی طرح اس آگ پر کھڑا ہوا کہتا ہوں کہ بارِ الٰہا! یہ میرا بیٹا لے لے' میرے بھائی کو لے لے' میری بیوی کو لے لے' اس محل کو لے لے' اور زمین پر جو کچھ پایا جاتا ہے' وہ سب لے لے' مجھے چھوڑ دے۔ خود غرض انسان کی طرح دنیا کی ہر شے داؤ پر لگا رہا ہوں۔ "ہرگز نہیں' وہ لپکتا ہوا شعلہ

ہے، بڑھتا ہوا آرہا ہے، کلیجے کو کھینچ لینے والا ہے۔ ہر اُس انسان کے لیے ہے جو منہ پھیر کر چلا گیا تھا، جس نے مال سینت سینت کر رکھا۔"

آواز آتی ہے۔ "پکڑ لو اس کو، بھاگنے نہ پائے۔ اس کو جہنم میں ڈال دو۔ اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دو۔ یہ وہ انسان ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتا تھا، جو غریبوں اور مسکینوں کو کھانا کھلانے کی تلقین نہیں کرتا تھا۔"

اور وہ جہنم! جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہاں میری غذا خون اور پیپ ہوگی، اژدھے لپک رہے ہوں گے، میں بھاگنا چاہوں گا مجھے بھاگنے نہیں دیا جائے گا۔ میں سوچتا ہوں کہ کاش میرا یہ حشر نہ ہوتا۔ مجھ سے یہ سوال نہ ہوتا۔ یہ ذمہ داریاں مجھ پر نہ ہوتیں۔ کوئی مجھ سے حساب نہ لیتا۔ میں ایک پتھر ہوتا۔ میں ایک درخت ہوتا۔ ایک پرندہ ہوتا ---- کم از کم ایک تنکا ہوتا۔ اے کاش! اے کاش!!!

---

# تعلیمی پالیسی' زبان اور ثقافت

طارق جان

ہماری قومی زندگی کے الجھے ہوئے مسائل میں سے ایک بہت الجھا ہوا مسئلہ ذریعہ تعلیم کا ہے۔ ملکی اور قومی تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر تعلیمی پالیسی بنائی جاتی' اور یکسوئی سے اس پر عمل کیا جاتا' تو ہماری تعلیمی پیش رفت نہایت تیز رفتار ہوتی لیکن تضاد اور کشمکش سے توانائیاں ضائع ہو رہی ہیں۔ ہر قومی تعلیمی پالیسی میں ذریعہ تعلیم کے طور پر زبان کے کردار کو گھٹانے کی کوشش کی گئی ہے' اور انگلش میڈیم اداروں کو جواز فراہم کیا گیا ہے' جو قوم کو طبقات میں تقسیم کرتے ہیں۔ یقیناً ہمارے پالیسی ساز ثقافت کی تشکیل میں زبان کے کردار کا شعور نہیں رکھتے۔

زبان کیا ہے؟ کیا یہ محض خیالات کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے؟ یا یہ ایک ایسا اہم وسیلہ ہے جس کے ذریعہ ایک مخصوص ثقافت کی اقدار کو منتقل کیا جاتا ہے؟ دوسرے لفظوں میں کیا یہ ایک بے جان اور بے قیمت چیز ہے' یا یہ کسی قوم کی ثقافتی اقدار' قومی مزاج اور نظریات کی حامل ہے؟

اگر تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ زبان' بہ یک وقت خیالات کے اظہار کا ذریعہ اور ثقافتی اقدار اور قومی مزاج کی حامل بھی ہے' تو پھر سوال یہ ہے کہ (انگلش کو ذریعہ تعلیم ماننے کی صورت میں) آپ ہماری نوجوان نسل کو اس انگریزی ثقافت سے کیسے بچائیں گے' جو کہ انگریزی زبان کے ہم رکاب ہے' جو انگریزی کے قالب میں روح کی طرح بستی ہے۔

پوری تاریخِ انسانی میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی قوم نے کوئی غیر ملکی زبان قبول کی ہو اور اس کے ثقافتی عناصر سے بچی رہی ہو۔ دراصل کسی زبان کو اس کے مخصوص ثقافتی اثرات سے پاک کرنے کے لیے کوئی آلہ ہے ہی نہیں۔ یہ امرِ واقعہ ہے کہ غیر ملکی زبان قبول کرنے والی قوم کو اس زبان کے ثقافتی عناصر کو قبول نہ کرنے کا قطعاً اختیار نہیں ہوتا۔

ایک دفعہ جب زبان کے بھیس میں اغیار کی ثقافت قبول کرنے کا عمل شروع ہوتا ہے' تو

کے فرشتے اترتے ہیں۔ جو اللہ کا نام لیں اور کہیں کہ ہمارا رب تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے، ان کا فرض ہے کہ وہ اس نام کے لیے کھڑے ہو جائیں اور کھڑے ہو کر اس کا اعلان کریں۔ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الکہف ۱۸:۱۴)۔

یہ ایمان اور یہ جہاد ہی وہ دو چیزیں ہیں جن سے اسلامی انقلاب کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ جو زندگی ایمان کے نور سے منور ہو گی، جو زندگی جہاد کی راہ پر گامزن ہو گی، وہی زندگی اسلامی انقلاب کی منزل سے ہمکنار ہو گی۔ ایمان کا چراغ آپ اپنے دل کی محراب میں روشن کر دیں، یہاں تک کہ آپ کی پوری زندگی منور ہو جائے۔ اپنے دل میں ایمان کا شعلہ اس طرح سجائیں کہ وہ ستارے کی طرح چمک کر ساری دنیا کو زندگی کی نئی راہیں دکھائے۔ ایمان کا بیج اپنے دل کی کھیتی میں ڈالیں، آرزو اور جستجو، اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ کے پانی سے اس کی آبیاری کریں، تو وہ تناور درخت نمودار ہو گا جس کے پھل ساری انسانیت سدا کھاتی رہے گی۔

بھائیو اور بہنو! اس ایمان کی روشنی اپنے دل میں سجایئے، اس کو ستارے کی طرح چمکایئے، اس کو دنیا کا، اپنے ملک کا، اپنی قوم کا، اپنی زندگی کا رہبر بنایئے۔

جاننے کی ضرورت ہمیں اس بات کی ہے کہ اگر انقلابی کردار ایمان اور جہاد سے بنتا ہے، وہ انقلابی کردار جس کے بغیر ہم اسلامی انقلاب کی منزل سے ہمکنار نہیں ہو سکتے، تو پھر ایمان کیا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟ ایمان کی حقیقت جاننا اور سمجھنا ہو تو یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا صرف ایک جملہ ایمان کی ساری حقیقت آشکار کر دیتا ہے۔ فرمایا: اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○ (الانعام ۶:۷۹)، "میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں"۔ یعنی میں نے اپنی شخصیت کا، اپنی زندگی کا، رخ ہر طرف سے کاٹ کر صرف اس کی طرف کر لیا ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ گویا میں سب سے کٹ کر صرف اس سے جڑ گیا ہوں، وہی میرا مقصود و منزل بن گیا ہے اور میں اس میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ گویا نہ رخ کسی اور کی طرف کرتا ہوں، نہ مقصود و منزل کسی اور کو بناتا ہوں، نہ شخصیت اور زندگی کے حصے بخرے کرتا ہوں کہ ایک کا رخ کسی طرف ہو، دوسرے کا قبلہ کچھ اور ہو۔

جب آپ نے اپنا رخ، اپنے چہرے کا رخ، اپنی زندگی کا رخ اللہ کی طرف کر لیا، اور صرف اسی کی طرف کر لیا، تو آپ نے ایمان کے معنی پا لیے۔ اس کے بعد اللہ ہی زندگی کا مقصد ہے، وہی قبلہ ہے، وہی مطلوب ہے، اسی کی طرف چلنا ہے، اسی کی طرف دوڑنا ہے۔

اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے نماز کو دیکھیے۔ جب آپ نماز پڑھتے ہیں، اگر آپ کا رخ قبلہ

نہیں۔

تمام دنیا میں، اور خاص کر مغرب میں، ثانوی تعلیم کو ایک قدامت پسندانہ عمل سمجھا جاتا ہے، جس کے ذریعے نوجوانوں کو سوسائٹی کی اقدار، معاشرتی طور پر مُسلّمہ سچائیوں اور پسندیدہ روّیوں کی تعلیم کے ذریعے مہذب بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ انھیں ہر طرح کے متنازعہ امور سے الگ رکھا جاتا ہے، کیونکہ یہ معاشرتی ابتری اور سماجی عدم مطابقت کو جنم دیتے ہیں۔ انھیں انفرادیت کی تعلیم، بعد میں صرف اس وقت دی جاتی ہے جب ان کی شخصیت سازی کرتے وقت انھیں مخصوص بندھنوں میں رہنے اور سوچنے کا پابند بنایا جا چکا ہوتا ہے۔ لیکن یہاں ہمارے ہاں انگلش میڈیم اسکولوں کے ذریعہ بچے ابتدا ہی سے معاشرہ کے اندر موجود مُسلّمہ حقیقتوں سے معرکہ آرائی کے عمل سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

چند ماہ بیشتر میں نے انگلش میڈیم اسکولوں کا ایک تجزیاتی مطالعہ کیا۔ اپنے اس مطالعے اور تجزیے کے سلسلے میں، میں نے دس سوال ترتیب دیے، جن کے جوابات طلبہ سے حاصل کرنا تھے۔ اس تجزیاتی مطالعے کا مقصد انگلش میڈیم اسکولوں کے طلبہ پر ان اسکولوں کے ثقافتی اثرات کا جائزہ لینا تھا۔

اس تجزیہ کی رُو سے ایسے اسکولوں کے ۵۵ فیصد طلبہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد پاکستان میں رہنا نہیں چاہتے۔ کچھ سکولوں میں تعلیم کی تکمیل کے بعد پاکستان میں قیام کی خواہش نہ رکھنے والے ان طلبہ کی اوسط ۶۶ فیصد تھی۔ صرف ۷ فیصد طلبہ اقبال کو پڑھ سکتے ہیں، جبکہ ان سے بھی کم تعداد ایسے بچوں کی بھی ہے جو اقبال کو سمجھ سکتے ہیں۔ ۵۸ فیصد طلبہ انگریزی ناول اور افسانہ پڑھتے ہیں جبکہ صرف ۱۴ فیصد نماز پڑھتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ پاکستان میں قیام کے خواہشمند طلبہ اور نماز ادا کرنے والے طلبہ میں ایک بامقصد قسم کی ہم آہنگی اور ارتباط پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں، ادا کی جانے والی نمازوں کی تعداد غیر اہم اور بے معنی رہی۔ بلکہ مشاہدے میں یہ آیا کہ جو طلبہ مہینے میں صرف ایک نماز ہی ادا کرتے ہیں وہ بھی مغربی ملکوں کے بجائے پاکستان میں قیام کو ترجیح دیتے ہیں۔

یہ اس سارے مسئلہ کا ایک انوکھا اور عجیب پہلو ہے۔

اس کے بعد جب میں نے طلبہ کی بیرونی ممالک میں قیام میں خواہش پر پوری توجہ مرکوز کی، تو مجھے شدید قلبی اذیت پہنچی۔ کیونکہ میرے اندازے کے مطابق چالیس سے پچاس ہزار طلبہ انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھتے ہیں، اور یہ تعداد بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اوسطاً ۵۰۰

اس کی طرف چلنے کے بعد بھی دل نہ تھکتا ہے' نہ سیر ہوتا ہے۔ محبوب کے سامنے حاضر ہوتا ہے تو دل بھی حاضر ہوتا ہے' اور محبوب کا اشارہ ہوتا ہے دل اپنا سب کچھ لا کے حاضر کر دیتا ہے' اپنا مال بھی' اپنی زندگی بھی' اپنے رشتے بھی' اپنے تعلقات بھی' اور جب ضرورت ہو تو اپنی جان بھی۔ یہی محبت انقلابی ایمان کی تعبیر ہے' یہی محبت انقلابی ایمان کی مظہر ہے۔ یہی محبت انقلابی ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ محبت تو اللہ کے برگزیدہ بندوں کا مقام ہے۔ وہ غلط سمجھتے ہیں۔ قرآن تو کہتا ہے کہ مومن ہے ہی وہ جو اللہ سے محبت کرے' اور سب سے بڑھ کر اسی سے محبت کرے۔

محبت کے بعد' جس ایمان سے انقلابی کردار بنتا ہے' وہ وفاداری اور اطاعت کے عہد کا نام ہے۔ ایمان صرف زبان سے اقرار کا نام نہیں ہے' ایمان اللہ تعالیٰ سے معاہدے کا نام ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ (التوبۃ ۹:۱۱۱) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں"۔ گویا ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے آپ کے جسم و جان اور مال خرید لیے ہیں۔ ہر چیز آپ نے اس کو بیچ دی ہے۔ اب کوئی چیز آپ کی نہ رہی۔ نہ ہاتھ پاؤں آپ کے رہے نہ آنکھ اور کان' نہ دل و دماغ آپ کے رہے' نہ گھربار اور کاروبار' سب اللہ کے ہو گئے۔

آپ نے تجدید ایمان کر لی' آپ راہ حق پر آ گئے' آپ نے اسلامی انقلاب کا جھنڈا ہاتھ میں اٹھا لیا' آپ نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کر دیا' آپ اللہ کی کبریائی کے لیے کھڑے ہو گئے' لیکن اگر آپ کا حال یہ ہو کہ آپ نے اپنا مال بھی اس سے بچایا' کہیں اور لگایا یا سینت کر رکھا' اپنے وقت کو بھی اس سے بچایا' اپنی توجہات کو بھی بچایا' اپنے تعلقات کو بھی بچایا' تو پھر یہ ایمان وفائے عہد نہیں' نقض عہد ہے۔ یہ ایمان انقلابی ایمان نہیں جو آپ کو اسلامی انقلاب کی منزل سے ہمکنار کر دے۔

سب سے بڑھ کر' انقلابی کردار کے ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں کہیں ظلم کی آمیزش نہ ہو۔ ظلم کے معنی کیا ہیں؟ ظلم کے معنی یہ ہیں جو کچھ صرف اللہ کا ہونا چاہیے آپ کسی اور کا کر دیں' یا اس میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کا حصہ لگا دیں۔ کسی اور کو شریک کر لیں۔ ایک قسم کے شریک تو وہ ہوتے ہیں جو نظروں سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ پتھر ہو سکتے ہیں' درخت ہو سکتے ہیں' چاند تارے ہو سکتے ہیں' اپنے جیسے انسان بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن بہت ساری چیزیں ہوتی ہیں جو نظر نہیں آتیں' مگر جو چھپ چھپ کے آپ کے دلوں میں وہ جگہ پا لیتی ہیں جو خدا کی جگہ ہے' آستینوں کے بت بن جاتی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے الفاظ میں وہ شرک بڑا خطرناک ہے جو ایک کالی چیونٹی کی طرح سیاہ چٹان کے اوپر رینگتا ہے اور کوئی اس کو نہیں پہچانتا۔ اس کو دیکھنا بھی مشکل' اس سے ہوشیار رہنا بھی مشکل' اس

سوال : آپ کے خیال میں قرآن کے بارے میں کونسی چیز آپ کو پریشان کرتی ہے؟ کیا جو کچھ آپ قرآن میں پڑھتی ہیں وہ آپ کی پریشانی کا باعث بنتا ہے؟

فرح : نہیں بلکہ میری پریشانی کا باعث وہ قوانین ہیں، جو قرآن میں موجود ہیں۔

ایک خاتون مسلمہ کے خیال میں مذہب کی تخلیق سیاسی بنیادوں پر ہوئی ہے۔ یہ خاتون اسلام کو متعصبانہ صنفی نقطہ نگاہ سے دیکھتی ہے اور کہتی ہے "اسلام کی نشوونما پدر شاہی معاشرہ میں ہوئی ہے اور اس (اسلام) نے پدر شاہی معاشرہ کو مستحکم کیا . . . . . . . . . . قرآن کے متعلق یہ خاتون کہتی ہیں "جب بھی میں نے قرآن کو پڑھا اس کے تحکمانہ انداز بیان نے مجھے پریشان کیا۔ چنانچہ قرآن کے خدا کا میرے لیے کوئی وجود نہیں ہے۔ (بحوالہ بالا صفحہ ۱۳۶ - ۱۴۰)

کیا یہ ایک ایسی نادر رَوِش ہے جس کے پیچھے کوئی محرک نہیں ہے؟ یا پھر یہ ایک ایسی رَوِش ہے جس کی مکمل سرپرستی اور آبیاری کی جا رہی ہے، تاکہ مطلوب نتائج حاصل کیے جائیں؟ یہ ایسے سوالات ہیں کہ جن کے جوابات جاننا، اس دنیا کو سمجھنے کے لیے جس میں ہم رہتے ہیں اور ان کارپردازوں کو سمجھنے کے لیے جو اس سارے عمل کے ہدایت کار ہیں، بہت ضروری ہے۔

۱۹۷۳ میں جاری ہونے والے آسپن انسٹیٹیوٹ (Aspen Institute) کی ایک مطالعاتی رپورٹ میں، ڈاکٹر لیونارڈ مارکس (Leonard Marks) کہتے ہیں :

> براہ راست مواصلاتی سیارے کے قابل عمل ہونے سے بہت سے بین الاقوامی الیکٹرانک نشرگاہوں کے سلسلے وجود میں آئیں گے، جو ثقافتی استحکام اور اطلاعات کے بہاؤ سے متعلق حقیقت پسندانہ سوالات پر توجہ مرکوز کریں گے۔ بین الاقوامی سطح پر الیکٹرانک نشرگاہوں کی توسیع کا قابلِ لحاظ تک، دوسری کسی چیز کی بجائے قوموں کی ثقافتوں پر زیادہ اثر ہو گا۔ ہماری حکمتِ عملی میں اس حقیقت کو بھی لازمی طور پر پیش نظر رکھنا ہو گا۔

انہوں نے اپنی اسی رپورٹ میں یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ "مواصلات سے متعلق ٹیکنالوجی پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہونی چاہیے"۔

میں نے تعلیمی پالیسی کے انتہائی اہم رخ کو آپ کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ استعماریت (Colonialism) اب قصۂ ماضی بن چکی ہے۔ ایسا کہنے والے اس تلخ حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ نو آبادیاتی نظام کبھی بھی مکمل طور پر رخصت نہیں ہوتا۔

دنیا آپ کا مقصود نہیں' یہ دنیا آپ کی محبوب نہیں۔ محبوب و مطلوب تو بس وہی کچھ ہے جو موت کے بعد ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (الزمر ۳۹: ۲۲)' "اب کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا اور وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر چل رہا ہے (اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس نے ان باتوں سے کوئی سبق نہ لیا؟)"۔ گویا جس کا سینہ اللہ تعالیٰ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے وہ اپنے رب کی طرف سے نور پا لیتا ہے۔ جس کے دل میں ایمان کا نور داخل ہو جائے' اس میں فراخی پیدا ہو جاتی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا' یارسولؐ اللہ' اس کی علامت بیان فرمایئے۔ ارشاد ہوا' آخرت کی طرف میلان ہو' دنیا سے بے رغبتی اور یکسوئی ہو' موت سے پیشتر اس کی' یعنی' اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی تیاری ہو۔ یہی بات ہمارے پیارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور انداز میں یوں بیان فرمائی' وَاقْطَعْ عَنِّیْ حَاجَاتِ الدُّنْیَا بِالشَّوْقِ اِلٰی لِقَائِکَ۔ یعنی اللہ سے ملاقات اس طرح محبوب ہو جائے' اللہ سے ملاقات کا شوق اس طرح دل میں اتر جائے کہ دنیا کی حاجتیں' دنیا کی چاہتیں' دنیا کی تمنائیں' دنیا کے مطالبات' ان سب کی جڑ کٹ جائے۔

ایمان انقلابی کردار کو ایسی تازگی عطا کرتا ہے جو لازوال ہے۔ آپ اللہ کی رضا کے طلب گار ہیں' آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے معنی اس کی جنت ہے' وہ جنت جس کی وسعت میں زمین اور آسمان سما جائیں۔ اگر آپ کا مقصود اور مطلوب واقعی وہ جنت ہے جس کی وسعت میں زمین اور آسمان سما جائیں' تو میں آپ سے کہوں گا کہ آپ کے ایمان کو' اور اس پر قائم انقلابی کردار کو کم سے کم اتنا سدا بہار' اتنا سرسبز اور اتنا ابدی تو ہونا چاہیے' جتنی جنت سرسبز ہے' جتنی جنت سدا بہار ہے' جتنی جنت ابدی ہے۔ جو ایمان آج ہے اور کل نہ ہو' جو ایمان گردش زمانہ سے سرد پڑ جائے' باطل سے شکست کھا جائے' آزمایشوں میں ترغیب و خوف کا شکار ہو جائے' آخری سانس تک سلامت نہ رہے' جو ایمان دنیا کی ایک لہر میں بہہ جائے' وہ ایمان اس جنت میں کیسے لے جا سکتا ہے' جو ابدی ہے۔ انسان کی فطرت ایسی ضرور ہے کہ حالات کے لحاظ سے ایمان پر کیفیات کے مختلف ادوار آ سکتے ہیں' لیکن اللہ تعالیٰ کو وہ ایمان مطلوب ہے جو ہر اتار کے بعد اور زیادہ اوپر اٹھ جائے' ہر خزاں کے بعد اور زیادہ رنگ لائے اور مہکے' جو آخری سانس تک جان زندگی بنا رہے۔

جس نے اپنا پورا رخ صرف اللہ کی طرف کر لیا' اور اس بات کو جان لیا اور مان لیا کہ ساری قوتوں کا سرچشمہ صرف اللہ تعالیٰ ہے' مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ (الکہف ۱۸: ۳۹)' وہی سب سے بڑا ہے' اللہ اکبر' تو آپ بتایئے کہ اس کے بعد کائنات کے اندر کون سی دولت ہے جس کا لالچ ایمان کو متزلزل کر دے' یا

# اسلام اور جمہوریت

روبن رائٹ / مسلم سجاد

"اسلام اور جمہوریت" اور "مسلم ممالک میں جمہوریت کا حال اور مستقبل" کے مباحث آج مسلمانوں میں بھی شدت سے زیر بحث ہیں' مغربی ممالک میں بھی یہ مباحث فکری بھی ہیں اور عملی بھی۔

مسلمانوں میں ایک طرز فکر یہ ہے کہ جمہوریت کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ یہ اپنے ظاہر و باطن کے لحاظ سے ایک شیطانی و لادینی فلسفہ و نظام ہے۔ اسلامی جمہوریت ایک لایعنی اور مجموعہ اضداد ترکیب ہے۔ مسلمانوں کے مزاج و روایات سے اس کا کوئی جوڑ نہیں۔ جمہوریت میں بندوں کو تولا نہیں گنا جاتا ہے' جبکہ قرآن نے واضح کردیا ہے کہ "اکثریت جاہل اور گمراہ ہوتی ہے۔" اگر اسلام میں جمہوریت کی گنجایش ہو بھی' تو یہ عملاً ناکام ہو چکی ہے۔ دوسری طرف یہ طرز فکر ہے کہ جمہوریت تو ایک نظام ہے جو تمدنِ انسانی کو بہتر انداز سے چلانے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ اگر یہ حاکمیتِ الٰہی کے تابع ہو تو اسلامی جمہوریت کی اصطلاح بالکل بجا ہے' اور خلافت و شورائیت کی حامل۔ اور اس میں کتنے ہی نقائص ہوں' آج کے دور میں یہی سب سے بہتر نظام ہے۔

ایک زندہ تہذیب کی روایات کے مطابق جمہوریت پر شدید نقد و نظر کے باوجود' مغرب تو ہے ہی جمہوریت کا علمبردار' لیکن وہاں بھی اس حوالے سے دو طرزِ فکر ہیں۔ ایک طرف یہ کہ اسلام کی تعلیمات' مسلمانوں کا مزاج' اور ان کی روایات و تاریخ' جمہوریت کی روح اور فلسفہ اور اس کے نظام کے یکسر منافی ہیں۔ اس لیے مسلمان نہ جمہوریت قبول کرسکتے ہیں' نہ یہ ان کے ہاں چل سکتی ہے۔ اگر احیائے اسلام کے علمبردار جمہوریت کا راگ الاپتے ہیں اور جمہوری انتخابات میں حصہ لیتے ہیں' تو ان کا مقصد صرف ایک دفعہ برسراقتدار آجانا ہے۔ حصول اقتدار کے بعد وہ جمہوریت کی بساط لپیٹ کر رکھ دیں گے۔ اس دلیل کے پیچھے فکری سے زیادہ سیاسی محرک ہے' کہ

لیکن دراصل یہ اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ انتہا پسندی' تحریکوں کو مہنگی پڑی ہے۔ (۴) اسلامسٹوں نے محسوس کرلیا ہے کہ ۹۰ کا عشرہ مل جل کر رہنے کا زمانہ ہے۔ اب وہ ہر ناپسندیدہ چیز کو مٹا دینا نہیں چاہتے۔ اپنے معاشروں میں مغربی تصورات پر عمل کے ناکام تجربات کے بعد اب اسلامسٹ تعمیری متبادل پیش کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی اخلاقی اقدار کو جدید زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ "سب مسائل کا حل اسلام ہی ہے۔" کا نعرہ تو ہو سکتا ہے لیکن بہرحال ایک ناکافی بات ہے۔(۴)

اسلامسٹوں کو نہایت نازک چیلنج درپیش ہے۔ بین الاقوامی ماحول ان کے لیے سازگار نہیں ہے۔ پُرتشدد واقعات نے مغربی نقطۂ نظر کو متاثر کر رکھا ہے۔ دلائل کے برخلاف' غلط طور پر ہی سہی' اسلام کو اصلاً انتہا پسند سمجھا جارہا ہے۔ مختلف طرح کی تحریکوں کو ایک ہی قرار دیا جارہا ہے۔

ہم دو دُور دراز علاقوں میں اسلام کی فعالیت کا مطالعہ کریں گے۔ شمالی افریقہ میں الجیریا' اور وسط ایشیا میں مسلم ریاستیں۔ دونوں جگہ اسلام سوشلسٹ نظام کے لیے چیلنج بن کر ابھرا ہے۔

## الجیریا کی مثال

الجیریا اسلام اور جمہوریت کے ساتھ ساتھ چلنے کا اولین ٹیسٹ کیس بن گیا ہے۔ وہاں انتخابات میں عوام کے سامنے سابقہ حکومت کی تیس سالہ کارکردگی' اور اس کے بالمقابل اسلامک فرنٹ کی توانا اور دیانتدارانہ قیادت تھی۔ انھوں نے سابقہ حکمرانوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے کھل کر اسلامک فرنٹ کو ووٹ دیا۔ پہلے مرحلہ میں اسے ۲۳۱ میں سے ۱۸۸ نشستیں حاصل ہوگئیں۔ مکمل اکثریت حاصل کرنے میں صرف ۲۸ کم تھیں' جو صاف نظر آرہا تھا کہ دوسرے مرحلہ میں یقیناً مل جائیں گی۔ ایرانی انقلاب کے بعد کسی اسلامی پارٹی نے مخالف حکومت کو جمہوری ذرائع سے شکست دے کر اتنی شاندار فتح حاصل نہ کی تھی۔ لیکن دنیا کی اس پہلی اسلامی جمہوریت کو کام کرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ دوسرے مرحلہ سے پانچ روز پہلے شاذلی بن جدید سے استعفیٰ لے کر وزیر دفاع کی سربراہی میں اعلیٰ اسٹیٹ کونسل قائم کردی گئی۔ اسلامک فرنٹ پر پابندی لگا دی گئی۔ اس کے نو ہزار ہمدرد' اور بعض ذرائع کے مطابق تیس ہزار گرفتار کرکے صحرا کی شدید گرمی میں کیمپوں میں پہنچا دیے گئے۔ درجنوں میئر اور اسمبلی کے تمام جیتے ہوئے ممبران اس میں شامل تھے۔ ان میں ہزاروں ائمہ بھی تھے۔ نو ہزار مسجدوں میں سے چالیس فیصد کے امام ہٹا دیے گئے۔

ان اقدامات کا ہدف تو اسلامک فرنٹ تھا' لیکن اصل شکار جمہوریت۔ اس کُو (Coup) کی

ناکامی اسی طرح مقدر ہے جس طرح ماسکو والے کُو کی تھی۔ بس یہاں اسلامسٹوں نے غیر معمولی نظم و ضبط کا مظاہرہ کیا ہے اور حکومت کی جانب سے خونریزی کی ہر کوشش کو روکنے کی کوشش کی ہے۔

مغرب کے رویے اور پالیسی نے ثابت کردیا کہ وہ حقوق اور آزادی کے کتنے ہی گُن گائے' اگر اسلامی جمہوریت سے واسطہ پیش آنے لگے تو وہ پولیس اسٹیٹ کو اس پر ترجیح دیں گے۔ مغرب کی جانب سے عدم مذمت (بلکہ امداد) نے فوجی ٹولے کے حوصلے بڑھادیے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی جمہوریت کے تجربہ کے لیے الجیریا بہترین ملک تھا۔ وہ مغرب سے قریب اور متاثر ہے۔ ان کا اصل مطالبہ شریعت کا نفاذ تھا۔ آخر پاکستان اور سعودی عرب میں اسلامی قوانین نافذ ہیں اور وہ مغرب کے مفاد سے ٹکراتے بھی نہیں۔(۵) صدارتی انتخاب ۱۹۹۳ تک ہونے تھے' اور یہ نئی حکومت کو قابو میں رکھنے کے لیے ایک موثر صورت تھی۔ آخری بات یہ ہے کہ اسلامسٹوں کی حکومت بنا کر انھیں جوابدہ بنانا' ان کو خفیہ سرگرمیوں پر مجبور کرنے کے مقابلے میں قابل ترجیح ہونا چاہیے تھا۔

اب بہت وقت گزر چکا ہے۔ الجیریا میں بالآخر اسلامسٹ ہی غالب رہیں گے۔ مغرب کے لیے اصل خطرہ یہ ہے کہ فوجی حکمرانوں پر دباؤ ڈالنے یا اس کی مذمت کرنے میں پس و پیش کو اس کی اسلام دشمنی پر محمول کیا جائے گا۔ اس کے اثرات الجیریا سے باہر بھی ہوں گے۔

## وسط ایشیا میں احیائے اسلام

وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں میں' سیاسی ارتقا کے حوالے سے "احیائے اسلام پارٹی" کی شاخیں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ ۱۹۹۱ میں یہ ماسکو میں رجسٹر ہوگئی ہے۔ لیکن اسلام کے سیاسی قوت بننے کے خوف کی وجہ سے پانچ میں سے چار ریاستوں میں اس پر پابندی ہے۔

۱۹۹۵ میں سوویت عہد کے بعد پہلے عام انتخابات ہوں گے۔ اس موقع پر غیر معمولی سیاسی تبدیلیاں متوقع ہیں۔ پانچوں ریاستوں میں کیمونسٹوں کا' جو نئے ناموں سے سامنے آرہے ہیں' جمہوریت پسندوں اور اسلامسٹوں سے مقابلہ ہوگا۔ وسط ایشیا کے کیمونسٹ مشرقی یورپ سے سبق حاصل کرکے سیاسی نظام میں آزادی دیتے نظر نہیں آرہے۔ معاشی آزادی کے وعدوں کے باوجود' بیش قیمت سرکاری املاک' جو ان کی قوت کی بنیاد ہیں' ابھی تک فروخت نہیں کی گئی ہیں۔

دیگر مسلم معاشروں کے برخلاف اس علاقے کے مسلمانوں کا جمہوریت سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی سابقہ نہیں رہا ہے۔ تاجکستان اور ازبکستان میں تعلیم یافتہ افراد کی نہایت قلیل تعداد جمہوری

پارٹیوں کی طرف متوجہ ہے' لیکن ڈیڑھ سو سال کے نو آبادیاتی دَور کے بعد یہاں کے مسلمان فطری طور پر اپنی اصل تہذیبی بنیادوں کی طرف پلٹ رہے ہیں۔ روسی زبان کے بجائے ترکی اور فارسی زبان اختیار کر رہے ہیں۔ یہ واضح ہے کہ مستقبل کی تشکیل میں اسلام کو اہم حصہ ادا کرنا ہے۔

ان ریاستوں میں ایک تو اس اسلام کے آثار ہیں جو سوویت دَور میں بھی موجود تھا' اسے سرکاری اسلام کہا جاسکتا ہے۔ اور دوسرا عوامی اسلام ہے' جو ستّر کے عشرے سے زیرِزمین مذہبی سرگرمیوں اور خفیہ مساجد کی صورت میں تھا' اور اب احیائے اسلام کی شکل میں کھُل کر سامنے آگیا ہے۔

اس وقت احیائے اسلام پارٹی کے اہداف' سیاسی' معاشی اور مذہبی دائروں میں کمیونسٹ غلبہ کا خاتمہ' اسلامی تہذیب کی بحالی' اور شراب' منشیات اور قحبہ گری پر پابندی تک محدود ہیں۔ وہ شریعت کے قانون کو نافذ کروانا چاہتے ہیں' لیکن کوئی تھیوکریسی یا ایرانی ماڈل کی اسلامی جمہوریہ نہیں چاہتے۔ تاجکستان کے اسلامی رہنما نے ایرانی ماڈل کو مسترد کیا اور انقلابی اسلامی ریاستوں کے بارے میں مغرب اور روس کے اندیشوں کو بے بنیاد قرار دیا۔

گزشتہ سال وسط ایشیا اور شمالی افریقہ کے اسلامی رہنماؤں نے اسلامی جمہوریہ کے اپنے ماڈل وضع کرنے کے بارے میں نہایت معقول انداز سے گفتگو کی ہے۔ اس پر خود ان کے ہاں مختلف آرا ہیں۔ کچھ لوگ ترکی سے جمہوری روایات اور پاکستان سے اسلامی روایات لینے کی بات کرتے ہیں۔ سعودی عرب سے کوئی بھی مالی امداد کے سوا کچھ نہیں لینا چاہتا۔ سب کہتے ہیں کہ ان کی اسلامی جمہوریہ میں دوسری پارٹیوں کو اظہار رائے کی آزادی ہوگی۔ لیکن شراب نوشی' نشہ بازی اور قحبہ گری پر سخت سزائیں دی جائیں گی۔ ازبکستان اور تاجکستان میں اسلامسٹوں اور دوسرے جمہوری گروہوں میں رابطہ بھی ہے۔ ۱۹۹۲ میں تاجکستان میں اسلامسٹوں اور جمہوری قوتوں کے تعاون سے جو مظاہرہ ہوا' وہ سماجی تحریک کے بعد کمیونسٹ حکمرانوں کے خلاف سب سے بڑا مظاہرہ تھا۔

الجیریا کی طرح یہاں بھی جتنی دیر تک تمام پارٹیوں کو سسٹم کے اندر کام کرنے کا موقع نہیں دیا جائے گا' ان کی حکومتوں کو اتنا ہی زیادہ زخم خوردہ اور بے لچک اسلام سے چیلنج کا خطرہ بڑھتا جائے گا۔

ازبک قیادت نے مذہبی تعطیلات بحال کردی ہیں' لیکن ساتھ ہی مذہبی جماعتوں کو سیاست

میں حصہ لینے سے اور علما اور ائمہ کو انتخابات لڑنے سے منع کردیا ہے۔ قازقستان میں حزب اختلاف کی صرف سیکولر جماعتوں کو جائز تسلیم کیا گیا ہے۔ آزادی کے بعد پہلے سیاسی قائدین مقامی اسلامی جماعت کے سات افراد تھے۔ ان پر غیرقانونی اجتماعات کرنے اور صدر کی توہین کرنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ پورے وسط ایشیا میں پرانے کمیونسٹ یہ دلیل دیتے پھر رہے ہیں کہ سیاسی اسلام کا راستہ روکنے کے لیے انھیں اقتدار میں رہنا چاہیے۔

مغرب نے وسط ایشیا میں بھی اسلام کے بارے میں مزاحمت کا موقف اختیار کیا ہے۔ امریکی وزیر خارجہ جیمز بیکر نے اپنے دوروں میں یہی کہا کہ وہ ایران کے بجائے ترکی کی تقلید کریں۔ اپنے تین دوروں میں انھوں نے کسی ایک اسلامی رہنما سے ملاقات نہیں کی۔ کہنے کو تو امریکہ انسانی حقوق کی پاسداری کا اعلان کرتا ہے لیکن وسط ایشیا میں اس کا مطلب جمہوریت نوازی کے ساتھ ساتھ اسلام دشمنی بھی ہے۔

بش اور اب کلنٹن انتظامیہ وسط ایشیا اور الجیریا میں وہی غلطی دہرا رہی ہے جو کارٹر نے ایران میں کی تھی، یعنی اسلامسٹوں سے واقفیت حاصل کیے بغیر ہی ان کی مخالفت۔ مغرب نے سرد جنگ کے اس سب سے اہم سبق سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے کہ کسی مخالف قوت کو ختم کرنے کے لیے مخالفت کے بجائے تعاون زیادہ موثر ثابت ہو سکتا ہے اور موجودہ صورت میں تو یہ مخالفت حقیقی سے زیادہ خیالی ہے۔ الجیریا کی طرح یہاں بھی مغرب کی اپنی بہتری اسی میں ہے کہ حقیقی جمہوری فضا بحال کرنے کی حوصلہ افزائی کرے جس میں اسلامسٹ بھی کام کریں، بجائے اس کے کہ ان مطلق العنان حکومتوں کی حمایت کرے جو انھیں باہر رکھتے ہیں۔

اسلامی سرگرمیوں کے بارے میں مغرب کے اندیشے قبل از وقت محسوس ہوتے ہیں۔ ایران اور پاکستان نے یہاں سب سے پہلے تعلقات بڑھائے لیکن ان کی سرگرمیاں مناسب ہی ہیں۔ ایران کے پاس نہ اتنے وسائل ہیں اور نہ ایسا ارادہ کہ وہ اس علاقے میں بے جا مداخلت کرے۔ وسط ایشیا کے اسلامسٹ ایران کے نقش قدم پر چلنے میں کوئی فائدہ بھی نہیں دیکھتے۔

مغرب اور اسلام اپنے تعلقات میں ایک دوراہے پر پہنچ چکے ہیں۔ دس برس قبل کے ایران کے معاملہ کو نمونہ نہیں بنانا چاہیے۔ بدقسمتی سے اسلام سے سیاسی کشمکش اور مستقبل کے امکانات کے باوجود، مغرب کے پاس اس سے معاملہ کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی حکمت عملی نہیں جو اس نے شاہ ایران کی برطرفی کے موقع پر آیت اللہ خمینی کے ساتھ اختیار کی تھی۔

## دو متبادل راستے

اسلامی اثرات میں اضافہ کے ساتھ، مغرب کے پاس دو متبادل راستے ہیں۔ اولاً یہ کہ مسلم ممالک میں حقیقی جمہوریت کے لیے دباؤ ڈالے، اور غیر جانبدار انتخابات کے جو نتائج ہوں انھیں تسلیم کرلے۔ اس صورت میں وہ نئی اسلامی حکومتوں پر، اگر وہ جمہوریت کو ترک کریں تو بغیر اسلام دشمن بنے، دباؤ ڈال سکے گا۔ آیندہ چند برس اسلام اور جمہوریت دونوں کے مستقبل کے لیے اہمیت رکھتے ہیں۔ جمہوریت مغرب میں کامیاب ہی ہے، لیکن اب عالمی چیلنج یہ ہے کہ اسلامی اور کمیونسٹ معاشروں میں بھی کامیاب ہوتی ہے یا نہیں۔ اس لمحہ، اسلام کے جمہوری اظہار کو روکنے کے بجائے آگے بڑھانا چاہیے۔

دوسرا متبادل یہ ہے کہ، ان حکومتوں کی مدد کی جائے جو ان اسلامی تحریکوں کو کچل رہی ہیں۔ ایسی پالیسی اتنی ہی طویل اور مہنگی ہوگی جتنی کمیونزم سے لڑنے کی ہوئی، اور اس سے زیادہ مشکل ہوگی۔ ایسے نظریہ کو چیلنج کرنا جس کے ساتھ ایک ناکام معاشی نظام ہو آسان ہے، لیکن صدیوں پرانے مذہب اور تمدن سے مقابلہ آسان نہیں۔ امریکا کو اس مقصد کے لیے ناخوشگوار حلیف تلاش کرتے ہوں گے۔ حافظ اسد سے قذافی تک سب کی جمہوریت دشمنی مُسلّمہ ہے۔ یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اسلامی تحریکوں کو اقتدار میں آنے سے روکنے کی خفیہ یا کھلی پالیسی اختیار کرنے سے مغرب کے بدترین اندیشے پورے ہوں گے، یعنی مختلف اور منتشر اسلامی گروہ مغرب کے خلاف ایک متحدہ طاقت بنیں گے، اور دہشت پسند اور انتہا پسند سرگرمیوں میں اضافہ ہو گا اصل خطرہ یہ ہے کہ اس سے مغرب اور مشرق کی خلیج میں اضافہ ہوگا جو پہلے ہی خونیں ماضی رکھتے ہیں۔

احیائے اسلام آج مغرب کے لیے چیلنج ہے۔ مگر ایک غیر معمولی موقع امکانیات سے بھرپور بھی۔

---

### حواشی

۱۔ اسلامسٹوں، یعنی اسلامی تحریکات نے کبھی ایسی کسی کارروائی کے ارتکاب میں پہل نہیں کی۔ ایسی کارروائیاں یا تو سیکولر اور سوشلسٹ قوم پرستوں کی طرف سے ہوئیں، یا اسلامی تحریکات کے خلاف ایک عرصہ کے انتہا پسندانہ ریاستی جبر و تشدد کے ردِّعمل کے طور پر چند وابستگان کی طرف سے: مصر میں اخوان المسلمون کو بار بار غیر قانونی قرار دیا گیا، حسن البنا کو شہید کرایا گیا، اور جمال عبدالناصر کے دور میں ہزار ہا ہزار اخوانیوں کو بدترین تعذیب کا شکار بنایا گیا، اور آج بھی لگاتار، انصاف کے معمولی تقاضے بھی پورے کیے بغیر، مصر کے نوجوان پھانسی پر لٹکائے جارہے ہیں۔ انڈونیشیا میں دارالاسلام کو فوج کشی کے ذریعہ کچل دیا گیا، پاکستان میں سیّد مودودی کو

پھانسی کی سزا دی گئی' شام و عراق میں ہزاروں نوجوانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ الجیریا کی داستان مقالہ نگار خود سنا رہی ہیں۔

۲ - اسلامی تحریکات میں شروع ہی سے نظام کے اندر رہ کر نظام کو بدلنے' اور جہاں بیلٹ کی آزادی دستیاب ہو وہاں اسی کو اختیار کرنے کا رجحان غالب رہا ہے۔ حسن البنا شہیدؒ خود انتخاب میں کھڑے ہونا چاہتے تھے' جماعت اسلامی نے پاکستان بنتے ہی بیلٹ کا راستہ اختیار کیا اور مولانا مودودیؒ نے یہاں تک کہا کہ جب تک پرامن انتخاب سے تبدیلی لانے کا راستہ کھلا ہے' کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا "شرعاً جائز نہیں"۔ لیکن اکثر و بیشتر تو بیلٹ ہاتھ دیا ہی نہیں جاتا' اور دیا جاتا ہے تو اسلامسٹوں کا وہی حشر ہوتا ہے جو الجیریا' مصر' تیونس' وسط ایشیا وغیرہ میں ہو رہا ہے۔

۳ - یہ موقف شرع و عقل کی بنیاد پر اختیار کیا گیا ہے۔ جب انتہا پسندی اختیار ہی نہیں کی گئی تو مہنگی پڑنے کا کیا سوال۔

۴ - اہل مغرب نے اس بات کو سمجھنے میں ہمیشہ ٹھوکر کھائی ہے کہ اس نعرہ کا یہ مدعا کبھی نہیں رہا کہ ہر مسئلہ کا حل کتابوں میں لکھا موجود ہے۔ ایک دائرہ اسلام کے احکام و حدود کا ہے' وہ نافذ ہوں گے اور بے شمار مسائل حل کریں گے۔ ایک دائرہ ان مسائل کا ہے جن کا حل مناسب تدابیر میں ہے' مثلاً سیاسی ڈھانچہ کا مسئلہ' بیروزگاری کا مسئلہ' ٹریفک کا مسئلہ' بیماریوں کا مسئلہ' ان کا حل مسلمان' اسلام کی رہنمائی میں' اپنی عقل استعمال کرکے سوچیں گے۔ یہ ایک بالکل "کافی بات" ہے۔

۵ - اسلامی تحریکات کا ہدف سعودی عرب اور پاکستان کے نمونہ کے شرعی قوانین نہیں ہیں۔ (خ-م)

---

# افتا و اجتہاد

## حافظ ابن قیمؒ

سید مودودیؒ کے الفاظ میں : "علامہ ابن قیمؒ کی کتاب اعلام الموقعین عن رب العالمین' فقہ اسلامی کی بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس میں علامہ موصوف نے اسلامی قانون کے ماخذ' اس کی روح' اس کے اسرار' اس کی حکمتوں' قیاس و استنباط کے طریقوں' اور اصولِ فتویٰ پر اس خوبی سے بحث کی ہے کہ اس کی نظیر علمائے اسلام کی تصانیف میں بہت کم پائی جاتی ہے"۔

ہم اس کتاب کے مختلف ابواب وقتاً" فوقتاً" قارئین کی خدمت میں پیش کرتے رہیں گے۔ (ادارہ)

دنیا میں جن چیزوں کے حصول کی دوڑ میں لوگ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے اور رشک کرنے میں لگے رہتے ہیں' ان میں سب سے اولیٰ و اعلیٰ چیز وہ ہے جو دین و دنیا میں بندے کی سعادت کی ضامن ہو' اور اس راہ میں اس کی رہنمائی بھی کرتی ہو۔ یہ چیز کیا ہے ؟ یہ علم نافع اور عمل صالح ہے۔ جس شخص کو علم و عمل کی دولت نصیب ہو گئی وہ دنیا و آخرت میں کامیاب و کامران ہو گیا' اور جو اس سے محروم رہا وہ بھلائی اور خیر کی ہر صورت سے محروم رہا۔ علم و عمل کی کسوٹی ہی پر نیک و بد' ظالم اور مظلوم کی پرکھ ہوتی ہے۔

چونکہ علم' عمل کا قرین اور اس کا رفیق ہے' نیز علم کا شرف معلومات کے شرف کے تابع ہے' اس لئے علوم میں علمِ توحید سب سے اشرف' اور علمِ احکام سب سے زیادہ نافع ہے۔ لیکن ان دونوں علوم سے روشنی کا حصول اسی وقت ممکن ہے جب اس روشنی کا منبع ایسی ذات ہو جس کا معصوم عن الخطا ہونا دلائل قاطعہ سے ثابت ہو' اور جس کا اتباع آسمانی کتابوں نے واجب کیا ہو۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے' جس کی زبان سے نکلا ہوا کوئی کلمہ اپنا نہیں ہوتا' بلکہ یہ اللہ کی طرف سے دی ہوئی وحی پر مبنی ہوتا ہے۔

## حضورؐ سے حصولِ علم کی صورتیں

حضورؐ سے حصولِ علم کی دو صورتیں ہیں: بالواسطہ حصول' اور بلاواسطہ حصول۔ دوسری صورت صرف صحابہ کرامؓ کے لیے ممکن تھی۔ اس میدان میں' ان کے بعد اب امت میں کوئی شخص ان کے ہم پلہ ہونے یا ان کے قریب پہنچنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ تاہم جو شخص صحابہ کرامؓ کی سیدھی راہ اختیار کرے گا' وہ دوسروں سے آگے نکل جائے گا۔ لیکن جو شخص ان کے راستے سے منہ موڑ کر دائیں بائیں چلے گا' وہ پیچھے رہ جائے گا اور گمراہی میں بھٹکتا پھرے گا۔ خیر کی کون سی صورت ہے جس کے حصول میں صحابہ کرامؓ دوسروں سے آگے نہیں نکل گئے؟ سلامت روی کی کونسی ایسی شکل ہے جسے انھوں نے نہیں اپنایا؟ بخدا' وہ اسلام کے حیات بخش چشمۂ صافی پر پہنچ کر پہلے خود سیراب ہوئے' اور پھر اسلام کی بنیادیں مضبوط کیں۔ انھوں نے قرآن اور ایمان کی روشنی میں' اپنے عدل و انصاف کے ذریعے لوگوں کے دل جیت لیے' اور شمشیرو سنان کے ذریعے جہاد کر کے ممالک فتح کر لیے۔ انھوں نے چراغِ نبوت سے جو کچھ حاصل کیا' اسے اس کی اصلی حالت میں تابعین کرامؒ کو منتقل کر دیا۔ ان کا سلسلہ سند --- یعنی از رب العالمین بوساطت حضرت جبرئیل علیہ السلام' بواسطہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم --- ایک درست اور عالی سلسلہ سند تھا۔ انھوں نے تابعین کرام سے فرمایا: "دین کا یہ خزانہ ہمیں اپنے نبیؐ سے ملا ہے' ہم نے اسے آپ تک پہنچا دیا۔ آپ کو پہنچانا ہمارے رب کی طرف سے ہم پر عائد شدہ فریضہ تھا' اب یہ فریضہ آپ پر عائد ہوتا ہے۔

تابعین کرامؒ نے' اس وصیت پر عمل کرتے ہوئے' صحابہ کرامؓ کے طریقے کو اپنایا' اور ان کے راستے پر ان کے قدم بہ قدم چلتے رہے۔ پھر حضرات تبع تابعینؒ نے ان کے راستے کو اپنا لائحۂ عمل بنایا۔ اپنے پیشروؤں کی نسبت سے ان حضرات کی حیثیت وہی تھی جس کا ذکر باری تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے کہ (ثلۃ من الاولین وقلیل من الاخرین) ایک بہت بڑا گروہ اگلوں کا اور تھوڑے سے پچھلوں میں۔ پھر قرنِ رابع کے ائمہ کا دور آیا۔ ان ائمہ کرام نے دین کی روشنی حضرات تبع تابعین سے حاصل کی۔ ان حضرات کے دل و دماغ میں اللہ کے دین کا درجہ اتنا برتر و بالا تھا کہ وہ اس پر کسی رائے' تقلید' قیاس یا عقل کو مقدم نہیں کرتے۔

پھر ان کے پیروکاروں میں سے جو حضرات' اصحابِ توفیق تھے' وہ ان کے نقش قدم پر چلتے رہے۔ ان سب کو اس سلسلے میں افراد کی خاطر تعصب برتنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بس حجت و استدلال کا ساتھ دیتے' اور جس طرف حق کا جھکاؤ ہوتا' اس طرف جھک جاتے۔ ان کا قیام اور ان کا کوچ' حق کی ہمرکابی میں ہوتا۔ جب ان کے سامنے ایسی دلیل آجاتی جو اپنی قوت کی بنا پر دل پر اثر کرنیوالی ہوتی تو وہ اس کی طرف فرداً فرداً اور گروہوں کی صورت میں لپک پڑتے۔ جب ان کے

کانوں میں رسولؐ کی آواز پڑ جاتی' یعنی کسی معاملے میں انھیں کوئی حدیث مل جاتی' تو وہ اس کی طرف دوڑ پڑتے' اور حضورؐ کے قول کے بارے میں کسی دلیل کا مطالبہ نہ کرتے۔ اللہ کے رسولؐ کے منصوص اقوال کا درجہ ان کے نزدیک اس قدر عظمت و جلال کا حامل تھا کہ وہ ان پر کسی کے قول کو مقدم کرنے یا رائے اور قیاس کے ذریعے ان کا معارضہ کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوتے۔

پھر کچھ ایسے لوگ ان کے جانشین بنے' جنھوں نے دین میں تفرقہ پیدا کیا' اور مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ ہر گروہ اپنے من گھڑت تصورات و مزعومات پر شاداں اور فرحاں ہو گیا۔ انھوں نے تعصب کو اپنے اپنے مسلک کے لیے دین داری کا درجہ دے کر اس کی پیروی اختیار کر لی۔ تعصب ہی کے ذریعے یہ اپنی دکان اور تجارت چمکاتے تھے۔ ان میں کچھ ایسے تھے جنھوں نے محض تقلید پر قناعت کر لی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ : "ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ایک طریقے پر پایا تھا' ہم سب ان کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ یہ دونوں گروہ راہِ صواب سے بہت دور چلے گئے۔ (معاملات) نہ تمھاری من گھڑت خواہشات پر موقوف ہیں' نہ اہلِ کتاب کی۔ علم کا مفہوم یہ ہے کہ حق بات کی معرفت اس کی دلیل کی بنا پر ہو۔ اندھی تقلید اور خواہشات کو بنیاد بنا کر تعصب برتنے میں جتلا اشخاص علما کے زمرے سے خارج ہیں' اور انبیا کی وراثت کے اونچے مقام سے نیچے گر چکے ہیں۔

### حفاظِ حدیث

دعوت الی اللہ' حضورؐ کی تعلیمات' آپؐ کے ارشادات' اور ان ارشادات کے معانی و مطالب کی تبلیغ' حزب اللہ میں شامل لوگوں اور رسولؐ اللہ کے راستے پر چل کر فلاح پانے والوں کا شعار رہا ہے۔ اس لیے آپؐ کی امت کے علما کی دو ہی قسمیں قرار پاتی ہیں۔

ایک قسم حفاظِ حدیث کی ہے اور ان حضرات نے ائمہ کرام اور فقہائے اسلام کے لیے دین کو محفوظ کر دیا' اور اس کے صاف چشموں کو گدلا جانے اور بگڑنے سے بچا لیا۔ حتیٰ کہ جب وہ لوگ جن کی قسمت میں اللہ نے بھلائی لکھ دی تھی' ان چشموں پر سیرابی کی غرض سے پہنچے' تو انھیں ہر قسم کے غل و غش سے صاف پاک پایا۔ لوگوں کی آرا نے ان کے اندر کوئی تبدیلی نہیں پیدا کی تھی۔

### فقہائے اسلام

علما کی دوسری قسم فقہائے اسلام کا گروہ ہے۔ ان حضرات کے اقوال کی بنیاد پر لوگوں کو احکامات کے متعلق فتویٰ دینے کا سلسلہ جاری رہا۔ انھیں استنباط احکام کی خصوصی مہارت حاصل تھی' اور انھوں نے حلال و حرام کے قواعد کی تشکیل پوری توجہ سے کی تھی۔ دنیا میں ان کی حیثیت وہی ہے جو آسمان میں ستاروں کی' ان کے ذریعے تاریکی میں بھٹکنے والے پریشان انسان کو راستہ ملتا ہے۔ کتاب

اللہ کے نص کی روشنی میں' ماں باپ کی اطاعت سے بڑھ کر' ان کی اطاعت فرض ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے کہ اولی الامر کی اطاعت کرو۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور متعدد صحابہ و ائمہ کا قول ہے کہ "اولی الامر سے مراد علما ہیں۔" امام احمدؒ سے روایت ہے کہ امرا' یعنی حکام' کی اطاعت صرف اس وقت کی جائے گی جب وہ مقتضائے علم کے مطابق احکامات جاری کریں گے' اس لیے ان کی اطاعت علما کی اطاعت کے تابع ہے۔ کیونکہ اطاعت صرف معروف میں ہوتی ہے' اس لیے جس طرح علما کی اطاعت حضورؐ کی اطاعت کے تابع ہے اسی طرح امرا کی اطاعت علما کی اطاعت کے تابع ہے۔

چونکہ اسلام کا قیام علما اور امرا کی اطاعت پر مبنی ہے' اس لیے دنیا کی صلاح کا دارومدار ان دونوں گروہوں کی صلاح پر ہے اور دنیا کا فساد ان دونوں کے فساد پر مبنی ہے۔ عبداللہ بن مبارکؒ اور دوسرے حضرات کا قول ہے: لوگوں میں سے دو گروہ ایسے ہیں کہ اگر وہ درست رہیں تو تمام لوگ درست رہیں گے' اور اگر ان میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو تمام لوگوں میں بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔ سوال کیا گیا کہ وہ کون سے گروہ ہیں؟ فرمایا: "بادشاہ اور علما"

## مقامِ افتا کی اہمیت

چونکہ اللہ کی طرف سے اس کی باتیں دوسروں تک پہنچانے کی بنیاد ان باتوں کے علم اور انھیں بیان کرنے میں صداقت پر ہے' اس لیے روایت اور فتویٰ کے منصب پر صرف وہی شخص فائز ہو سکتا ہے جو علم اور صدق بیانی کی صفات سے متصف ہو۔ یعنی' جس بات کو دوسروں تک پہنچانے چلا ہے اس کا خود اسے علم ہو' اس کا کردار صالح ہو' قول و فعل میں عدل کا رتبہ ہو' اور اپنی نشست برخاست اور طور طریقوں کے لحاظ سے خلوت و جلوت میں یکسانیت ہو۔

جب بادشاہوں کی طرف سے فرامین لکھنے اور ان پر مہر شاہی لگانے کا منصب اتنا اونچا ہے کہ اس کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا' تو پھر رب العالمین کی طرف سے فرمان نویسی (فتویٰ نویسی) کا منصب کس قدر اعلیٰ اور افضل ہو گا!

## افتا' رب العالمین کا منصب ہے

مقامِ افتا پر فائز ہونے والے شخص کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو منصب افتا کا اہل بنائے' اور اپنے اندر اس منصب کی صفات پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کرے۔ اس مقصد کے لیے اسے اپنے مرتبے اور مقام کا صحیح ادراک ہونا چاہیے۔ اس کے سینے میں حق گوئی و بے باکی کے سلسلے میں کوئی تنگی نہیں ہونی چاہیے' کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کا ہادی و ناصر ہے۔

یہ وہ منصب ہے جس پر خود رب العالمین متمکن ہے۔ ارشاد باری ہے' (وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ : النساء ۴ : ۱۲۷) "لوگ آپ سے عورتوں کے معاملے میں فتویٰ پوچھتے ہیں' کہہ دیجیے اللہ تمھیں ان کے معاملہ میں فتویٰ دیتا ہے"۔

جس منصب پر اللہ تعالیٰ خود متمکن ہو اس کے فضل و شرف اور قدر و منزلت کا کیا کہنا۔

فتویٰ نویس کو اس بات کا شعور ہونا چاہیے کہ وہ کس ذات کی نیابت کر رہا ہے۔ نیز اسے اس کا یقین بھی کر لینا چاہیے کہ کل قیامت کے میدان میں اس سے فتویٰ کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی اور اس مقصد کے لیے اسے اپنے رب کے حضور جواب دہی کرنا ہوگی۔

### اللہ کے بعد' حضورؐ مفتی ہیں

رسولؐ اللہ نے سب سے پہلے اللہ کی باتیں لوگوں تک پہنچائیں۔ افتا کے منصب عالی پر فائز ہونے والی سب سے پہلی ہستی سیّد المرسلین' امام المتقین' خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس تھی۔ آپؐ اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے۔ آپؐ اس کی وحی کے امین اور اللہ کی طرف سے اس کے بندوں کی طرف سفیر تھے۔ اس لیے آپؐ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی مبین کی روشنی میں فتوے دیتے تھے۔ ان فتووں کی زبان دو ٹوک ہوتی تھی۔

آپؐ کے دیے ہوئے یہ فتوے' وجوبِ اتباع کے لحاظ سے' نیز مسائل کے احکام میں قول فیصل بننے اور معیار ہونے کے اعتبار سے' کتاب اللہ کے بعد دوسرے نمبر پر ہیں۔ کسی مسلمان کے لیے اس کی گنجایش ہی نہیں ہے کہ ایک معاملے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فتویٰ موجود ہوتے ہوئے وہ اس سے منہ موڑ کر کسی اور طرف رُخ کرلے۔ حکم دیا ہے کہ مسائل کے احکامات معلوم کرنے کے لیے حضورؐ کے فتاویٰ کی طرف رجوع کیا جائے۔

(فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ' : النساء ۴ : ۵۹) "اگر تمھارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو"۔

### اصحاب النبیؐ

حضورؐ کے بعد فتویٰ دینے کے عظیم کام کا بیڑا قرآن کے محافظ اور رحمٰن کے سپاہیوں' صحابہ کرامؓ نے اٹھایا۔ ان کے قلوب سب سے زیادہ نرم' ان کا علم سب سے زیادہ پختہ' ان کے رویے میں سب سے کم تکلف' ان کا حسنِ بیان سب سے بڑھ کر' ان کے ایمان کی صداقت سب سے بلند' ان کی خیر خواہی میں سب سے زیادہ اخلاص اور اللہ کے ساتھ ان کا رابطہ سب سے زیادہ قریب تھا۔ ان میں سے

بعض صحابہؓ نے کثرت سے فتوے دیے' بعض میانہ رو رہے' اور اکثر نے بہت ہی کم فتوے دیے۔

حضورؐ کے جن صحابہ کرامؓ سے منقول فتووں کو محفوظ کرلیا گیا ہے' ان کی تعداد ایک سو تیس سے کچھ اوپر ہے۔ ان میں خواتین بھی شامل ہیں۔

جن صحابہؓ نے کثرت سے فتوے دیے ہیں' ان کی تعداد سات ہے : حضرت عمرؓ' حضرت علیؓ' حضرت عبداللہ بن مسعودؓ' ام المومنین حضرت عائشہؓ' حضرت زید بن ثابتؓ' حضرت عبداللہ بن عباسؓ' حضرت عبداللہ بن عمرؓ۔ ابن حزمؒ کا قول ہے کہ درج بالا حضرات میں سے ہر ایک کے فتاویٰ سے ایک ایک ضخیم کتاب بن سکتی ہے۔ نیز فرمایا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے فتووں کو بیس کتابوں میں جمع کیا گیا تھا۔

جو صحابہؓ فتویٰ دینے میں میانہ رَو تھے' ان کی تعداد تیرہ ہے : حضرت ابوبکرؓ' ام المومنین حضرت ام سلمہؓ' حضرت انس بن مالکؓ' حضرت ابوسعید خدریؓ' حضرت ابوہریرہؓ' حضرت عثمانؓ' حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص' حضرت عبداللہ بن زبیرؓ' حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ' حضرت سعدؓ بن ابی وقاص' حضرت سلمان فارسیؓ' حضرت جابرؓ بن عبداللہ اور حضرت معاذ بن جبلؓ۔ ان میں سے ہر ایک کے فتاویٰ اگر جمع کیے جائیں تو ایک ایک کتابچہ تیار ہو سکتا ہے۔ ان حضرات کے ساتھ حضرت طلحہؓ' حضرت زبیرؓ' حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ' حضرت عمرانؓ بن حصین' حضرت ابوبکرہؓ' حضرت عبادہ بن الصامتؓ اور حضرت معاویہؓ کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔

درج بالا صحابہ کرامؓ کے سوا' باقی صحابہؓ نے بہت کم فتوے دیے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک سے ایک یا دو یا اس سے کچھ زائد مسئلوں کے متعلق فتوے منقول ہیں۔

### صحابہؓ کا مقام

صحابہ کرامؓ جس طرح امت کے سردار ہیں' اسی طرح وہ علما اور مفتیوں کے بھی سردار ہیں۔

حضرت علیؓ سے عرض کیا گیا کہ ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے متعلق بتایئے۔ حضرت علیؓ نے پوچھا' کس صحابی کے متعلق ؟ عرض کیا گیا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق۔ آپ نے فرمایا: "انھوں نے قرآن پڑھا اور سنت کا علم حاصل کیا' اور پھر اس کی انتہا کو پہنچ گئے۔ یہی چیز ان کے لیے کافی تھی۔" پھر عرض کیا گیا کہ ہمیں حضرت حذیفہؓ کے متعلق بتایئے ؟ آپ نے فرمایا: "حذیفہؓ کو منافقین کے متعلق تمام صحابہؓ سے بڑھ کر معلومات تھیں"۔ حضرت ابوموسیٰؓ کے متعلق آپ نے فرمایا : "انھیں علم کے رنگ میں ہی رنگ دیا گیا تھا"۔ حضرت سلمانؓ کے بارے میں فرمایا: "وہ علم اول و آخر کے پہاڑ ہیں' وہ ایسے سمندر ہیں جو خشک نہیں ہو سکتا"۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: "عمرؓ کے متعلق میرا خیال ہے کہ علم کے دس حصوں میں سے نو حصے وہ لے گئے ہیں۔" انھوں نے یہ بھی فرمایا: "اگر عمرؓ کے علم کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور روئے زمین کے تمام افراد کے علم کو دوسرے پلڑے میں، تو عمرؓ کے علم کا پلڑا جھک جائے گا۔"

سعید بن المسیبؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ ہر ایسے پیچیدہ مسئلے سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے جسے حل کرنے کے لیے حضرت علیؓ موجود نہ ہوں۔ فرمایا کرتے تھے : کہ "اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بارے میں یہ گواہی دی تھی کہ وہ بڑے علم والے اور علم سکھانے والے ہیں۔ پھر آپؐ نے جن چار افراد سے قرآن سیکھنے کی تلقین فرمائی تھی، ان میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو سب پر مقدم رکھا تھا۔ عتبہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ میں نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جسے حضورؐ پر نازل ہونے والی کتاب کا عبداللہ ابن مسعودؓ سے بڑھ کر علم ہو"۔ یہ سن کر حضرت ابو موسیٰؓ اشعری فرمانے لگے کہ اگر تم یہ بات کہتے ہو تو تمھاری بات درست ہے کیونکہ ابن مسعود، حضورؐ سے اس وقت باتیں سنتے تھے جب ہم نہیں سنتے تھے اور وہ آپؐ کے پاس اس وقت ہوتے جب ہم نہیں ہوتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے کہ جب کبھی کوئی سورت نازل ہوتی تو مجھے اس کے نزول کے پس منظر کا علم ہو جاتا۔ اگر مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ فلاح شخص کتاب اللہ کے بارے میں مجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے اور اونٹوں کے ذریعے اس کے پاس جانا ممکن ہوتا تو میں ضرور اس کے پاس جاتا۔ زید بن وہبؒ کا کہنا ہے کہ میں حضرت عمرؓ کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اتنے میں حضرت ابن مسعودؓ آئے، حضرت عمرؓ سے قریب ہو کر بیٹھ گئے، جھک کر ان سے گفتگو کی، پھر چلے گئے۔ جب وہ واپس ہو گئے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: "یہ علم کا بھرا ہوا برتن ہے۔"

مسروقؒ سے پوچھا گیا کہ کیا حضرت عائشہؓ فرائض (یعنی وراثت کے مسائل) بہت اچھی طرح جانتی تھیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ خدا کی قسم! میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ میں سے بڑے بڑے اہل علم کو حضرت عائشہؓ سے فرائض پوچھتے دیکھا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے فرمایا کہ ہمیں کسی حدیث کے بارے میں اشکال ہوتا، اور پھر ہم عائشہؓ سے اس کے متعلق دریافت کرتے، تو ہمیں وہاں سے کچھ نہ کچھ معلومات حاصل ہو جاتیں۔

ابن سیرینؒ نے فرمایا: "صحابہ کرامؓ کی نظروں میں حضرت عثمانؓ کو مناسک کے بارے میں سب سے زیادہ معلومات تھیں، ان کے بعد حضرت عمرؓ کو۔ شہر بن حوشب کا قول ہے کہ صحابہ کرامؓ جب

گفتگو کرتے' اور وہاں حضرت معاذؓ بن جبل موجود ہوتے' تو سب کی نظریں ان کی جلالت قدر کی بنا پر ان کی طرف اٹھ جاتیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: "ابوذرؓ علم کو سب سے بڑھ کر محفوظ کرنے والے تھے۔ پھر علم کی اس مشک کو منہ پر بندھن لگ گئی' اس کے بعد اس سے کچھ نہیں نکلا' یہاں تک کہ وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مسروقؒ کہتے ہیں کہ میں مدینہ منورہ میں آیا' وہاں میں نے حضرت زیدؓ بن ثابت کو راسخین فی العلم میں سے پایا۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مجھے حضورؐ نے اپنے سینے سے لگا کر یہ دعا مانگی "اے اللہ' اسے حکمت سکھا دے۔" حضرت ابن عباسؓ نے یہ بھی فرمایا کہ مجھے حضورؐ نے اپنے پاس بلا کر میری پیشانی پر اپنا دست مبارک پھیرا اور پھر دعا کی کہ: "اے اللہ! اسے حکمت اور کتاب اللہ کی تاویل یعنی تفسیر کا علم سکھا دے۔" جب حضرت ابن عباسؓ کی وفات ہوئی تو محمد بن الحنفیہ نے فرمایا: اس امت کے ربانی (عالم) کی وفات ہو گئی۔" عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ نے فرمایا: "میں نے کسی کو نہیں دیکھا جو ابن عباسؓ سے بڑھ کر سنت کا علم رکھتا ہو' ان سے بڑھ کر جرات کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کرتا ہو اور ان سے زیادہ دقیقہ رس ہو۔ حضرت عمرؓ ان سے فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے سامنے بڑے پیچیدہ اور عاجز کر دینے والے مسائل آئے ہیں' آپ ہی انھیں اور ان جیسے دوسرے مسائل کو حل کر سکتے ہیں۔ طاؤسؒ کہتے ہیں کہ میں نے تقریباً پچاس صحابہ کرامؓ کی زیارت کی ہے۔ اگر حضرت ابن عباسؓ کوئی بات بیان کرتے اور دوسرے صحابہؓ اس کی مخالفت کرتے تو وہ ان سے مذاکرہ جاری رکھتے یہاں تک کہ انھیں قائل کر لیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ستر صحابہ کرامؓ کو دیکھا ہے کہ جب ان کے مابین کسی مسئلے میں اختلاف رائے ہوتا تو سب کے سب حضرت ابن عباسؓ کے قول کی طرف رجوع کرتے۔

شعبیؒ کا قول ہے کہ جس قاضی کو دو ٹوک فیصلہ کرنا پسند ہو' وہ حضرت عمرؓ کا قول اختیار کرے۔ مجاہدؒ کا قول ہے کہ جب کسی معاملے میں لوگوں کے مابین اختلاف رائے ہو جائے' تو پھر دیکھنا چاہیے کہ حضرت عمرؓ نے اس میں کیا فیصلہ کیا؟ ان کے فیصلے کو اختیار کر لیا جائے۔ سعید بن المسیبؒ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جو حضرت عمرؓ سے بڑھ کر علم رکھتا ہو۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے کہ اگر لوگ ایک وادی اور گھاٹی کی راہ اختیار کریں اور عمرؓ دوسری وادی اور گھاٹی کی راہ' تو میں عمرؓ کی وادی اور گھاٹی والی راہ اختیار کروں گا۔ بعض تابعین کا قول ہے کہ میں حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجھے ان کے سامنے دوسرے فقہا طفل مکتب نظر آئے' حضرت عمرؓ اپنے علم اور فقہ کی بنا پر ان سب پر غالب تھے۔

محمد بن جریر نے کہا: حضرت ابن مسعودؓ کے سوا کوئی ایسے صحابی نہیں تھے جن کے رفقا مشہور و معروف ہوں اور جنھوں نے ان کے فتاویٰ قلم بند کر لیے ہوں۔ لیکن حضرت ابن مسعودؓ بھی اپنا مسلک اور اپنا قول حضرت عمرؓ کے قول کی بنا پر ترک کر دیتے تھے۔ ایسا بہت کم ہوتا کہ حضرت ابن مسعودؓ مسائل میں حضرت عمرؓ سے اختلاف رائے کرتے اور ان کا قول چھوڑ کر اپنے قول کی طرف رجوع کرتے"۔ شعبیؒ کہتے ہیں کہ حضرت ابن مسعودؓ قنوت نہیں پڑھتے تھے' اگر حضرت عمرؓ قنوت پڑھتے تو وہ بھی ضرور قنوت پڑھتے۔

ہم ادارہ معارف اسلامی لاہور کے شکر گزار ہیں کہ اس نے ہمیں اس باب کے لیے زیر طبع مسودے سے اخذ و تلخیص کی اجازت دی۔ (خ - م)

---

# تحریکِ اسلامی میں انفاق فی سبیل اللہ

## تحریکِ مجاہدین کے حوالے سے

سید اسعد گیلانی

یوں تو دنیا کی تحریک مالی ایثار کا مطالبہ کرتی ہے لیکن اسلامی تحریک بالخصوص مالی ایثار اور مادی قربانیوں کا مطالبہ کرتی ہے' اس لیے کہ نظامِ باطل کے خلاف جدوجہد میں اسلامی تحریک سب سے زیادہ تہی دست ہوتی ہے۔ بالعموم تہی دست لوگ ہی اس طرف آتے ہیں اور اہلِ زر اس راستے کو خسارے کا راستہ سمجھ کر ادھر آنے سے گریز کرتے ہیں۔ اسلامی تحریک مالی ایثار و قربانی کے لیے انفاق فی سبیل اللہ کی قرآنی اصطلاح استعمال کرتی ہے۔

### اہلِ دل اور اہلِ زر

کسی تحریک کا پرچم بلند کرنے کے لیے فی الحقیقت اہلِ زر کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنی اہلِ دل کی ضرورت ہوتی ہے۔ بلاشبہ' مالی دشواریاں خود اپنی جگہ تحریک کے لیے ایک رکاوٹ ہوتی ہیں' لیکن ان دشواریوں کو تحریک کے پیروؤں کا جذبہ ایثار و قربانی خود ہی پورا کرتا رہتا ہے۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ جو اہلِ زر ادھر آتے بھی ہیں وہ بھی تحریک سے وابستہ ہو کر تہی دست ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف ایثار و قربانی کا جذبہ ان سے موجودہ پونجی لے لیتا ہے' اور دوسری طرف تحریک کے نئے نئے تقاضے اسے مزید روپے کمانے کی فرصت سے روک دیتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم' جو دعوت اسلامی کے آغاز سے پہلے مکہ مکرمہ کے ملک التجار تھے' آغازِ دعوت کے بعد مال و دولت کا بڑا حصہ دعوت کے کاموں پر لگانے کے سبب اس درجہ متمول نہیں رہے تھے۔

بلاشبہ اہلِ زر کسی تحریک کے لیے سروسامان کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

تبلیغی مہمات کے چلانے میں' جدوجہد کرنے میں' مال و اسباب کی فراہمی میں' ذرائع و وسائل کے سمیٹنے میں وہ بہت کام آتے ہیں اور مخالف قوتوں سے ٹکر کے موقع پر جب تحریک اپنے ہر فرد سے قربانی طلب کرتی ہے' تو جہاں لوگ اپنی جانیں لا کر حاضر کر دیتے ہیں وہاں اہلِ زر اپنے مال و اسباب لا کر سامنے رکھ دیتے ہیں۔ کوئی اپنا آدھا گھر دے دیتا ہے' تو کوئی پورا دے کر صرف اللہ اور اس کے رسول کے نام پر ہی توکل کر لیتا ہے' اور کوئی تجارتی قافلے کے سارے مال و اسباب پیش کر دیتا ہے اور یہ سب اس کلمہء حق کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے ہوتا ہے جس کو حق جان کر اور مان کر وہ اس کا ساتھ دیتے ہیں۔

لیکن فی الحقیقت تحریک کی اصل قوت اہلِ دل ہی ہوتے ہیں۔ اہلِ دل' اہلِ زر میں بھی ہوتے ہیں اور مفلس و قلاش جان نثاروں میں بھی ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کی بڑی تعداد تہی دست ہی ہوتی ہے۔ وہ وقت آنے پر اپنی راتوں کی نیندیں حرام کر کے مزدوریاں کرتے ہیں' دن کے چین ختم کر کے دوہری مشقتیں کر کے جو کچھ وہ لا سکتے ہیں لا کر تحریک کے قدموں میں رکھ دیتے ہیں۔ ان کا روپیہ ان کے پسینہ سے ڈھل کر آتا ہے' اور اس کی چمک دمک اور قیمت تحریک کے نزدیک مالداروں کے بڑے بڑے خزانوں سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے۔ انھی کے بل پر تحریکیں چلتی ہیں اور انھی کے نفوس سے انقلاب آتے ہیں۔

تحریک یہ نہیں دیکھتی کہ اس کے جان نثار اور مخلص حامیوں کے پاس کس قدر مال و دولت ہے' کتنی اونچی ان کی عمارات اور کتنے بڑے ان کے کاروبار ہیں۔ وہ صرف یہ دیکھتی ہے کہ اپنے مقصد کے لیے کتنا بڑا ان کا دل ہے' کتنا بڑا ان کا ایثار ہے' کس جرأت سے وہ قربانی پیش کرتے ہیں۔ تحریک کے نزدیک وہ درہم زیادہ قیمتی ہوتا ہے جو پسینہ نچوڑ کر کما کر لایا جاتا ہے' اس بھاری رقم کے مقابلے میں' جو خزانے کے اندر سے زکوٰۃ کے طور پر نکال کر حوالے کر دی جاتی ہے۔ دیکھنے کی چیز مال کی مقدار نہیں بلکہ دینے والے کا جذبہ ایثار ہوتا ہے' اور وہ حالات ہوتے ہیں جن میں وہ یہ ایثار کرتا ہے۔

## بخل کی مذمت

اسلام کی کتابِ انقلاب' قرآن نے اپنے پیروؤں کے سامنے مال و دولت کو سمیٹ سمیٹ کر رکھنے اور انفاق کر کے اللہ کے دین کے غلبہ کے لیے راستے ہموار نہ کرنے کے طرزِ عمل پر شدید تنقید کی ہے' اس لیے کہ تحریک کے مقابلے میں بخل وہ طرزِ عمل ہے جس کی قرآن نے شدید مذمت کی ہے۔ فرمایا:

دردناک خوشخبری سنا دو ان کو جو سونے اور چاندی کو جمع کر کے رکھتے ہیں اور انھیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اس سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اس سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا۔ لو' اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزا چکھو۔ (توبہ ۹: ۳۵)

مزید فرمایا: جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں' وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لیے اچھی ہے۔ نہیں' یہ ان کے لیے بہت بُری ہے جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں وہی قیامت کے روز ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔ زمین و آسمان کی میراث تو اللہ ہی کے لیے ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ (آل عمران ۳: ۱۸۰)

حدیث شریف میں آتا ہے کہ: حضرت اسماءؓ نے روایت کی' کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: خرچ کیا کرو' اور شمار نہ کیا کرو کہ اللہ تعالیٰ تم پر شمار کرے۔ اور بند نہ رکھا کرو کہ اللہ تعالیٰ تم پر بند رکھے۔ حسب استطاعت (اللہ کی راہ میں) کچھ خرچ کر دیا کرو۔ (متفق علیہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بخل و کنجوسی سے بچتے رہو اس لیے کہ بخل و کنجوسی نے تمھاری پیش رَو اقوام کو ہلاک کر دیا۔ انھیں اس نے اس بات پر انگیختہ کیا کہ وہ لوگ اپنوں کا خون بہائیں اور ان کے لیے جو امور حرام و ممنوع تھے انھیں حلال قرار دیں۔ (مسلم)

### غزوۂ تبوک کے موقع پر

چنانچہ جنگ تبوک کے موقع پر جب صلائے عام کے ذریعے مومنین کو مالی قربانیوں کی دعوت دی گئی تو سروسامان کی فراہمی میں ہر ایک نے اپنی بساط سے بڑھ کر حصہ لیا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے بڑی بڑی رقمیں پیش کیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنی عمر بھر کی کمائی کا آدھا حصہ لا کر رکھ دیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی ساری پونجی نذر کر دی۔ غریب صحابیوں نے محنت مزدوری کر کے جو کچھ کمایا' لا کر حاضر کر دیا۔ عورتوں نے اپنے زیور اتار اتار کر دے دیے۔ سرفروش رضاکاروں کے لشکر کے لشکر ہر طرف سے امنڈ امنڈ کر آنے شروع ہو گئے اور انھوں نے تقاضا کیا کہ اسلحہ اور سواریوں کا انتظام ہو تو ہماری

جانیں قربان ہونے کو تیار ہیں۔ جن کو سواریاں نہ مل سکیں وہ روتے تھے اور اپنے اخلاص کی بے تابیوں کا اظہار اس طرح کرتے تھے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دل بھر آتا تھا۔ یہ موقع ایمان اور نفاق کے امتیاز کا نشان بن گیا تھا۔ حتیٰ کہ اس وقت پیچھے رہ جانے کے معنی یہ تھے کہ اسلام کے ساتھ آدمی کے تعلق کی صداقت ہی مشتبہ ہو جائے۔ چنانچہ تبوک کی طرف جاتے ہوئے دوران سفر میں جو جو شخص پیچھے رہ جاتا تھا صحابہ کرامؓ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دیتے تھے اور جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم برجستہ فرماتے تھے کہ جانے دو، اگر اس میں کچھ بھلائی ہے تو اللہ اسے پھر تمھارے ساتھ لا ملائے گا، اور اگر دوسری حالت ہے تو شکر کرو کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی جھوٹی رفاقت سے تمھیں خلاصی بخشی۔ (تفہیم القرآن ج ۲، ص ۱۷۰)

غرض دَورِ اوّل کی اسلامی تحریک ہو یا بعد کے اَدوار کی اسلامی تحریکیں، حقیقت یہ ہے کہ ہر دَور کی اسلامی تحریکوں نے ایسے ایسے درخشاں نمونے تاریخ کے صفحات پر چھوڑے ہیں کہ آج ان نمونوں کو دیکھ کر ایمان تازہ ہوتا ہے، جذبہ انفاق فی سبیل اللہ بیدار ہوتا ہے، اور راہِ خدا میں سب کچھ لٹا دینے کا جذبہ انگڑائیاں لینے لگتا ہے۔

## تحریکِ مجاہدین کی مثال

ان تحریکوں میں ہماری تاریخ کی غریب ترین اسلامی تحریک، مجاہدین کی تحریک ہے، جس نے فی الحقیقت اپنے دَور میں، صحابہ کرام کے جذبہ ایثار و قربانی کی مثال تازہ کر دی۔ سید احمد شہید کی تحریک کے دامن میں ایسے بے شمار نمونے موجود ہیں جو بڑے ہی بیش بہا ہیں۔ گھروں سے مال و اسباب، جائیداد، کاروبار، زمین، کھیتی باڑی، تجارت سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر دُور دراز کی مسافتوں کے لیے نکل جانا، مدتوں تک گھروں سے باہر رہنا، زمینوں کو بے جُتی ڈال دینا، لاکھوں کے کاروبار کو خطرات کی بھینٹ چڑھا دینا اور خود راہِ حق میں جدوجہد کے لیے مصائب و آلام کا مسلسل شکار ہو جانا، مقدمات اور جیلوں میں پھنس کر چلتے ہوئے کارخانوں کو تباہی کے حوالے کر دینا، محلوں کو چھوڑ کر جیلوں میں جا بیٹھنا، غرض ایسی بے شمار مثالیں ہیں جو اس تحریک کے علمبرداروں نے اپنے عمل سے پیش کیں اور دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ چنانچہ اس مضمون میں ہم نمونے کے طور پر مجاہدینِ اسلام کی اس تحریک کے بعض واقعات آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تاکہ آپ دیکھیں کہ جن لوگوں نے اللہ کا راستہ اختیار کیا ہے انھوں نے کس طرح قدم قدم پر دنیا کو

ٹھکرایا اور آخرت کو ترجیح دی ہے۔

تحریک مجاہدین کے ایک بہت بڑے دشمن ڈبلیو' ڈبلیو ہنٹر نے بھی اس کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی کتاب میں ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

ملک کے اندر ایک منظم جماعت موجود ہے جو روپیہ پیسہ اور آدمیوں کے ذریعے دو ہزار میل دور سرحد پار کے باغی کیمپ کو مسلسل مدد دیتی رہتی ہے ... روپیہ بھجوانے کا ایک بہترین نظم ہے جو قائم ہے اور ان کی مہارت کا پتا دیتا ہے۔ (ڈبلیو' ڈبلیو ہنٹر' ہمارے انڈین مسلمان' ص ۲)

وہ روپیہ کہاں سے آتا تھا' کون دیتے تھے' اور کون فراہم کرتے تھے؟ ظاہر ہے کہ وہی مسلمان جو اپنے کاروباروں میں معروف تھے لیکن سمجھتے تھے کہ عاقبت کو درست کرنا خود بھی ایک کاروبار ہے بلکہ سب سے بڑا کاروبار ہے' اور جو اس کی طرف سے غافل ہے وہ تاجر بڑا گھاٹے میں ہے۔ چنانچہ مسلمان تاجروں اور مالداروں کی ایک بڑی تعداد تھی جو تحریک مجاہدین کے اس کام میں اسے مسلسل مدد دیتی رہتی تھی۔ پھر اس تحریک کے معاونین کے خلاف مقدمات کا سلسلہ شروع ہوا تو اس میں سینکڑوں افراد کو پھانسیوں اور عمر قید کی سزائیں سنا دی گئیں اور کتنے ہی لوگوں کی جائیدادیں ضبط ہوئیں۔ وہ ہنسی خوشی سب کچھ سہ گئے۔ اس طرح اسلامی تحریک کے راستے کی منازل طے ہوئیں۔

## انگریز کے مظالم اور مجاہدین کی قربانیاں

۱۔ قاضی میاں جان (بنگالی) پر مقدمہ چلا۔ ان کی جائیداد ضبط ہوئی اور انھوں نے اپنے گھر سے دور انبالہ جیل میں وفات پائی۔ (ایضاً ص ۹۷)

۲۔ محمد شفیع انبالوی فوجی چھاؤنیوں میں گوشت سپلائی کرنے کا ٹھیکہ دار تھا۔ لاکھوں کے کاروبار کا مالک تھا۔ اس کا مرکزی دفتر راولپنڈی میں تھا۔ ہر جگہ اس کی گماشتے مقرر تھے۔ وہ تحریک مجاہدین کا رکن تھا اور ستھانہ کی جہادی چھاؤنی کو بھی روپے اس کی معرفت جاتے تھے۔ جب وہ گرفتار ہوا تو اس کی پچاس لاکھ روپے کی جائیداد گورنمنٹ نے ضبط کر لی اور آخر دم تک واپس نہ کی۔ (مسعود عالم ندوی' ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک' ص ۱۳۴)

۳۔ الٰہی بخش پٹنہ کا بہت اچھا کاروباری تھا' لیکن تحریک مجاہدین کا مالی معاون تھا۔ جب مقدمہ چلا تو انھی مقدمات میں تباہ ہو گیا۔ (ایضاً ص ۱۳۸)

۴۔ مولانا احمد اللہ صادق پوری عظیم آباد کے ممتاز رئیسوں میں شمار ہوتے تھے مگر جب

گرفتار ہوئے اور سزائے موت ہوئی' جو بعد میں عمر قید میں بدل دی گئی' تو ان کا سارا کاروبار اور سب کچھ تباہ ہو گیا۔ جائیدادیں ضبط ہوگئیں اور وہ آخر دم تک خدا کا شکر ادا کرتے رہے کہ انھیں اللہ کی راہ میں اتنی قربانی کی توفیق ملی۔

۵۔ سر عبدالرحیم مشہور بنگالی قانون دان نے ایک موقع پر لکھا ہے: "وہابی" تحریک کے سبب سے حکومت نے مسلمان زمینداروں کی جائیدادیں جو پورے صوبے میں تھیں' ان کا تہائی حصہ ضبط کرلیا جس سے ہزاروں خاندان برباد اور پریشان ہو گئے (خطبہ صدارت' سالانہ اجلاس مسلم لیگ ۱۹۳۵)

۶۔ علمائے صادق پور کی غیر منقولہ جائیدادوں کی ضبطی' مکانات کے انہدام' سرحد پر مقیم افراد نیز دوسرے کارکنوں کے خلاف سخت کارروائی کرنے کی سفارش راونشا نے اپنی یادداشت میں پیش کی۔ چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ "جائیداد غیر منقولہ علمائے صادق پور سب ضبط کرلی گئیں۔"

راونشا نے مجاہدین کے تربیتی کیمپ صادق پور کے بارے میں بھی حکومت سے سفارش کی تھی۔ اس نے لکھا تھا "صادق پور کا احاطہ پٹنہ میونسپلٹی کو دے دیا جائے اور تمام مکانات زمین کے برابر کر دیے جائیں اور وہاں ایک بازار بنا دیا جائے۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ اچھا مصرف اس زمین کا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔" (یادداشت مرتبہ راونشا' ص ۳۰۔۳۲)

حد یہ کہ ظالموں نے مولانا احمد اللہ اسیر انڈیمان کا قیمتی کتب خانہ بھی ضائع کردیا اور ان کے بڑے بیٹے کا مختصر سا دواخانہ تک ضبط کر لیا۔ ان کا ظلم اس حد تک پہنچا کہ مکانات کے انہدام کے ساتھ ساتھ ان کی خاندانی قبریں تک کھود ڈالیں۔ راونشا کلکٹر پٹنہ نے حکومت سے درج ذیل سفارش کی: "سرحد میں مقیم مولوی حضرات کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔ ان کی جائیدادیں ضبط کرلی جائیں اور ان کے مقامی کارکنوں پر کڑی نگاہ رکھی جائے۔ خصوصاً حاجی بدر الدین ڈھاکہ اور مولوی عبدالجبار کلکتہ پر مقدمہ چلانا ضروری ہے۔" (ایضاً)

۷۔ "ڈاکٹر ہنٹر نے تو ہماری سرکار کو یہاں تک بھڑکایا کہ صادق پور پٹنہ کے علما کے مکانات جن میں قافلہ کے لوگ ٹھہرا کرتے تھے مع ان کے مکانات سکنی کھدوا کو پھنکوا دیے۔ پھر اپنے جعلی اور جھوٹے گواہوں سے جھوٹی گواہیاں دلوا کر ان بیچاروں کو کالے پانی روانہ کر دیا۔

(تواریخ عجیب' ص ۷۲ - ۷۷)

۸- "مولوی امیرالدین پر مالدہ میں بغاوت کا مقدمہ دائر کر دیا گیا- ہائی کورٹ سے اسے حبس دوام ،عبور دریائے شور کی سزا ہوئی اور ساتھ ہی پوری املاک کی ضبطی کی سزا سنائی گئی-" (مسعود عالم ندوی' کتاب مذکور ص ۱۵۴)

۹- ۱۸۷۰ میں متعدد اضلاع کے تبلیغی مرکز توڑ دیے گئے- ان کے سرکردہ لوگوں کو عدالتوں سے عبور دریائے شور اور املاک کی ضبطی کی سزا سنا دی گئی- (ایضاً ص ۱۵۶)

۱۰- ان سب اسیران بلا میں امیر خان کا معاملہ بہت عجیب و غریب ہے- ان کا چمڑے کا کاروبار بنگال اور بہار میں پھیلا ہوا تھا اور بڑے بڑے انگریز تاجر بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے- ...ان پر زبردست تشدد کیا گیا اور ان کے خلاف جھوٹا مقدمہ تصنیف کرنے کے لیے ۱۳ جھوٹے سرکاری گواہ پیش کیے گئے- امیر خان کو مجاہدین اور ان کے نصب العین سے لگاؤ تھا- ... جہاد کے کاموں میں وہ روپے سے مسلسل مدد کرتے رہتے تھے- بنگال کے مشرقی اضلاع سے جو رقمیں آتی تھیں وہ بسا اوقات انھی کی کلکتہ والی فرم کے واسطے سے پٹنہ اور پنجاب کو بھیجی جاتی تھیں- مگر حکومت نے ان کے خلاف جو کارروائی کی وہ سراسر غیر منصفانہ اور خلاف قانون تھی- (ایضاً' ص ۱۶۰-۱۶۱)

۱۱- محمد جعفر تھانیسری نے اپنی سرگزشت کالا پانی میں ذکر کیا ہے-:

۱۲ تاریخ دسمبر کو تھوڑی دیر خانہ تلاشی سے پہلے تک میں ہزاروں روپے کی جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ پر قابض تھا- بیسیوں آدمی میری ملازمت میں رہتے تھے- اپنے شہر کا نمبردار تھا' گھوڑے گاڑیوں میں سوار پھرا کرتا تھا- ہر کام کے لیے میرے گھر میں نوکر چاکر تھے یا پھر اس کے چند گھنٹے بعد جب میرے گھر کی تلاشی ہوئی اور میں فرار ہو گیا تو وہ سب جاہ و حشم یکایک خاک میں مل گیا-

بوجہ میرے فرار ہونے کے' انگریزوں نے ' قبل از صدور آخر مقدمہ کے' میری کل جائیداد تو پہلے ہی قرق کر لی تھی- دوسرے دن خود میرے عزیزوں کو کوئی اپنے برآمدوں میں بھی کھڑا نہ ہونے دیتا تھا- ایک ہی رات میں وہ سب مال دوسروں کا ہو گیا- میرے وارثوں کو اس قدر موقع بھی نہ ملا کہ کوئی جائیداد قبل از قرقی علیحدہ کروائیں - بعد از صدور حکم ضبطی کے' جب میرے بھائی نے' جو نصف کا وارث تھا' اپنے حصے کا دعویٰ کیا تو اس کو بھی فقط ایک کوٹھڑی دے کر کل جائیداد منقولہ و غیر منقولہ ضبط کر کے نیلام کر دی- میں نے بہ نظر

دور اندیشی اپنے حصے کی کل جائیداد اپنی بیوی کے مہر میں لکھ کر اپنی بیع نامہ بھی پیش کیا، مگر مارے غصے اور تعصب کے کسی نے بھی کچھ نہ سنا اور میری بیوی کو مع دو نابالغ شیر خوار بچوں کے ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر نکال دیا۔" اس طرح آج میں اگر رئیس شہر تھا تو دوسرے دن قلاش شہر۔" (محمد جعفر تھانیسری 'کالا پانی' ص ۵۶-۵۷)

۱۲- "اولیائے وقت شمس الاسلام مولوی احمد صاحب ماہ مئی ۱۸۶۵ میں دائم الحبس بعبور دریائے شور ہوئے اور ساتھ ہی ان کی مکمل جائیداد ضبط کر کے ان کے وارثوں کو کنگال کر دیا گیا۔ (ایضاً' ص ۶۰-۶۱)

## ایثار کے نمونے

جب سید صاحب نے جہاد کی تیاریاں شروع کی تھیں اس وقت بھی لوگوں کے رضاکارانہ مالی ایثار کا یہی حال تھا۔ دراصل ملت اسلامیہ میں ضمیر کی یہ خلش ہمیشہ رہی ہے کہ کسی صورت اسلامی نظام اپنی خالص صورت میں برپا ہو جائے اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب کبھی کوئی ایسی کوشش ان کے سامنے آتی تھی جو ان کے قلب کو مطمئن کر سکے تو مالی ایثار میں کبھی کوتاہی نہ کرتے تھے۔ چنانچہ ایک شیخ غلام علی صاحب کے ایثار کا مختصر واقعہ درج ذیل ہے۔: "شیخ صاحب دن میں دو مرتبہ سید صاحب سے ملنے کے لیے آتے۔ ایک مرتبہ نماز ظہر کے وقت' دوسری دفعہ بعد نماز مغرب' دونوں مرتبہ بیش بہا نذریں ساتھ لاتے' مثلاً نہایت قیمتی پارچے' عمدہ بندوقیں' اور تلواریں بعض اوقات نقد روپیہ لے آتے۔ واقف کار اصحاب کا اندازہ ہے کہ بارہ پندرہ روز کے قیام میں شیخ صاحب نے اس طریق پر جو نذریں پیش کیں وہ بحیثیت مجموعی ۲۰ ہزار روپے کی مالیت سے کم نہ تھیں۔ ایک دوسرے صاحب شیخ غلام علی رئیس الہ آباد کا ذکر ہے: "جہاد کے لیے روانگی کے موقع پر وہ آئے تو قسم قسم کے اسلحہ' خیمے' کپڑوں کے تھان' کتابیں' برتن لائے۔ بیسیوں چھوٹے چھوٹے ڈولچے اور ان کے لیے لمبی لمبی رسیوں کا انتظام کیا اور سب چیزیں غازیوں میں تقسیم کیں۔"

## غازیوں کے ایثار کی غیر معمولی مثال

خود غازیوں کے ایثار و قربانی کا حال یہ تھا کہ جب سرحد میں جہاد کا آغاز ہو گیا اور سکھوں کے مقابلے میں معرکے شروع ہو گئے تو ایک فتح کے بعد جنگ زیدہ میں جب مال غنیمت جمع ہوا تو اس کی قیمت کا اندازہ ۲۵ ہزار روپے لگایا گیا۔ امیر لشکر نے پانچواں حصہ بیت المال

کے لیے۔ رکھ کر باقی بیس ہزار غازیوں میں تقسیم کر دینے کا حکم دیا۔ مقامی لوگ تو اپنے اپنے حصے لے کر چلے گئے لیکن ہندوستانی غازیوں نے امیر لشکر سے عرض کیا "ہم تو بیت المال سے لے کر کھاتے ہیں، بیت المال سے ہی کپڑا اور دوسری ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ بیت المال سے ہی ہتھیار لیتے ہیں تو پھر ہم حصہ لے کر کیا کریں گے۔ یہ بھی آپ بیت المال میں ہی داخل فرمالیں۔ امیر لشکر نے کہا کہ جو بھائی خوشی سے اپنا حصہ بیت المال کو دیں گے اس کا ثواب خدا سے جدا پائیں گے۔ چنانچہ اکثر نے اپنا حصہ واپس لوٹا دیا۔ بعض اصحاب نے بھی صرف وہ چیزیں رکھ لیں جن کی ان کو فوری ضرورت تھی۔ (غلام رسول مہر: سید احمد شہید، ج دوم، ص ۱۳۷)

اللہ کے ان عظیم بندوں کو اللہ کے مال کا اتنا شدید احساس تھا کہ مولوی باقر علی عظیم آبادی جنگ میں جب گولی کھا کر گر پڑے تو بیٹھ گئے اور بولے:

"بھائیو میرا کام تمام ہوا، اب مجھ سے ہتھیار لے لو، یہ اللہ کا مال ہے، کسی اور کے کام آئے گا۔"

کیسی تربیت تھی، کیسا احساس ذمہ داری اور کیسا جذبہ ایثار تھا۔ اس راستے میں آگے بڑھے تو اپنا سب کچھ لٹا کر آگے بڑھے اور دنیا کی متاع غرور میں سے کوئی حصہ اپنے نفس کے لیے بچا کر نہ رکھا۔ اسلامی تحریکیں ایسی ہی ہوتی ہیں اور ایسے ہی ایثار پیشہ کارکن کسی اسلامی تحریک کے معیاری اور مثالی کارکن کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں۔

---

حضرت امام غزالیؒ سے بعض جعلی کتابیں بھی منسوب ہیں لیکن زیر نظر ان کی آخری زمانے کی' اپنی تصنیف ہے۔ امام علیہ الرحمہ نے اس کتاب کو سلجوقی سلطان محمد بن ملک شاہ کے لیے تحریر کیا تھا۔ جس کے اسلاف دین کے محافظ تھے اور خود اس نے بھی ۲۰ سال تک بڑی قابلیت اور کامیابی سے حکومت کی۔ کتاب کا پہلا حصہ بنیادی اعتقادی مسائل اور شرعی فرائض سے متعلق ہے' اور دوسرا: بادشاہوں' وزیروں اور حکومتی اہل کاروں کی سیرت اور فرائض پر ہے۔ امام غزالیؒ کہتے ہیں کہ جب تک حکمران کے اسلامی عقائد مضبوط نہیں ہوں گے اسلامی طرز کی حکمت عملی نہیں چل سکتی۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ عدل و انصاف کا منبع خود حکمران ہیں اور اس کے کردار کا اثر سلطنت اور اہل کاروں پر ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ اسلام میں اخلاقیات اور سیاسیات جدا نہیں۔

فاضل مترجم ڈاکٹر سمیع اللہ قریشی متعدد ممالک میں پاکستان کے سفیر رہے ہیں۔ دور حاضر میں اس قدیم کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے موصوف کہتے ہیں کہ ہر قوم کے کلچر کی کچھ بنیادی قدریں ہوتی ہیں۔ غزالیؒ کے دور کے کلچر کی قدریں آج خود پاکستانی کلچر کی بنیادیں ہیں' جیسے خوف خدا' عاقبت میں محاسبے کا ڈر' طاقت کو عارضی سمجھنا وغیرہ۔ یہی قدریں طاقت کے نشے کو بریک لگاتی ہیں۔ ڈاکٹر قریشی کے خیال میں غزالیؒ نے جس موضوع کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے وہ عدل و انصاف ہے۔ چنانچہ اس کتاب کا بیشتر حصہ اس حدیث نبویؐ کی تفصیل و تشریح ہے: اَلْمُلْکُ یَبْقٰی مَعَ الْکُفْرِ وَلَا یَبْقٰی مَعَ الظُّلْمِ۔ امام غزالیؒ نے حکمرانوں کے سخت ترین محاسبے کا تصور دیا ہے۔ ان کے خیال میں معاشرے میں بدعنوانی (کرپشن) یا دیانت داری کا انحصار حکمران کے کردار پر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر حکمران دیانت دار ہوں گے تو عوام میں دیانت داری ہوگی۔ یہ امر کہ معاشرے میں بدعنوانی' بدکاری' رشوت وغیرہ رائج ہیں یا نہیں؟ حکمرانوں کے طرز عمل پر منحصر ہوتا ہے۔ غزالیؒ نے حسب موقع قدیم انداز کی حکایتوں کو مختلف نکات کی وضاحت کے لیے استعمال کیا ہے اور قرآن و حدیث کے حوالے بھی جگہ جگہ دیے ہیں۔

امام رحمہ اللہ کی یہ کتاب' آج بھی عوام و خواص کے لیے ایک اہمیت رکھتی ہے۔ صوری محاسن سے آراستہ' یہ کتاب اعلیٰ معیار اشاعت پر پوری اترتی ہے۔ (د-ص)

**قرآن' اہل کتاب اور مسلمان**' محمد رضی الاسلام ندوی۔ ناشر: ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی' علی گڑھ۔ صفحات: ۲۹۳۔ قیمت: ۷۰ روپے۔

یہودی' عیسائی اور مسلمان بڑے بڑے وحدانیت پرست (monotheistic) گروہ ہیں۔ ذات باری کی صفات و کمالات کے بارے میں ان میں اختلاف ہے تاہم اس کے وجود پر تینوں گروہ ایمان رکھتے

# کتاب نما

**اسلام اور مشرق و مغرب کی تہذیبی کشمکش : از علی عزت بیگووچ- ترجمہ : محمد ایوب منیر- ناشر: ادارہ معارف اسلامی' ملتان روڈ لاہور- صفحات ۳۹۵- قیمت درج نہیں-**

یہ کتاب جمہوریہ بوسنیا کے صدر جناب علی عزت بیگووچ کی تصنیف Islam between East and West کا ترجمہ ہے- فاضل مصنف نے کمیونزم اور (اب) مسیحی تعصب کے خلاف ایک طویل جدوجہد کی ہے- نصف صدی پر محیط اس جہاد کے دوران میں انھوں نے اپنے متعدد ساتھیوں سمیت قیدوبند کی صعوبتیں بھی برداشت کی ہیں- ایسے معروف سیاستدان سے کسی بلند پایہ علمی کام کی توقع مشکل ہی سے کی جاسکتی ہے' مگر اس کتاب کو پڑھیں' پھر اس کے مصنف کی شخصیت کو ذہن میں لائیں تو قحط الرجال کے اس عہد میں ایک خوشگوار حیرت ہوتی ہے- ایک شخص اپنے دور کے تقریباً" تمام اہم افکار و نظریات کا مطالعہ' پھر ان کا تقابل و تجزیہ کرتا ہے' دوسری طرف انتہائی مشکل حالات میں اپنی قوم کی ایسی عملی راہنمائی کرتا ہے کہ مسلمانان بوسنیا ترقی یافتہ دنیا کی علانیہ مخالفتوں اور خفیہ سازشوں کے باوجود پوری ثابت قدمی کے ساتھ اپنی بقا کے لیے مصروف جہاد ہیں- علمی و فکری راہنمائی کا ایسا امتزاج' آج کی ملت اسلامیہ میں شاذو نادر ہی نظر آتا ہے-

زیر تبصرہ کتاب کا موضوع انسان' اس کی مختلف سرگرمیوں کی نوعیت اور اس کے لیے صحیح اور فطری راہنمائی ہے- آغاز' انسان کی ابتدا کے بارے میں بحث سے ہوتا ہے- مصنف کا خیال ہے کہ اس بارے میں سائنس کا فیصلہ ڈارون کا پیش کردہ نظریۂ ارتقا ہے- اس فیصلے کو سائنس کی نوعیت کی روشنی میں دیکھنا چاہیے- سائنس کا مقصد عقل (یعنی منطق) سے کام لے کر مادی دنیا کی تسخیر ہے اور اس کا مقصود انسان کا جسمانی فائدہ ہے- اس طرح سائنس کا دائرہ کار انسان کے باہر کی مادی دنیا بنتا ہے' مگر سائنس نے اپنی حدود سے آگے بڑھ کر جاندار اشیا اور خود انسان کی حقیقت کے بارے میں فیصلہ دینا چاہا اور اس کوشش میں

آدمی کی ایک مشینی اور مفاد پرستانہ تصویر پیش کی' یعنی ڈارون ازم۔ یہ تصویر انسان کی مکمل تصویر نہیں ہے' کیوں کہ ابتدائی دور کی پسماندہ ترین اقوام میں بھی مفاد سے بالاتر ہو کر سوچنے' حواس خمسہ سے ماورا عالم کا تصور رکھنے اور مذہبی نوعیت کے رسم و رواج بجالانے کے آثار ملتے ہیں۔ ایسی روحانی سرگرمیوں کی کوئی مادی (یعنی ڈارون ازم پر مبنی) تشریح ممکن نہیں۔ مزید یہ کہ انسان کی تمدنی زندگی کے برعکس اس روحانی اور ثقافتی دنیا (ادب' مصوری اور مذہب) میں کوئی ارتقا نہیں دیکھا گیا۔ مادی لحاظ سے پسماندہ ترین معاشرے بھی اس معاملے میں اتنے ہی آگے ہیں جتنی کہ آج کی انتہائی ترقی یافتہ مغربی اقوام۔ یہ روحانیت ہی انسان کا جوہر' پہچان اور کائنات میں اس کی انفرادیت ہے۔

کتاب کے پہلے پانچ ابواب میں مادیت اور روحانیت کے مظاہر کا طویل بیان ہے۔ کہا گیا ہے کہ سائنس و مادہ پرستی کی شکلیں : تمدن' ترقی' ٹیکنالوجی' تعلیم' معاشرہ' بڑے شہر' مفاد عامہ' عمل اور مارکسزم ہیں۔ دوسری طرف یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کے روحانی پہلو کا اظہار ادب' ثقافت' انقلاب' انسانی اقدار' تصوف' انفرادی آزادی' دیہاتی زندگی' حقوق انسانی' نیت اور مذہب (اپنے محدود مفہوم میں) کی صورت میں ہوتا ہے۔ کتاب میں ایک ایک مادی مظہر کو لیا گیا ہے اور اس کا تقابل کسی نہ کسی روحانی سرگرمی سے کر کے انسان کی ایک دو پہلو تصویر پیش کی گئی ہے۔ چوں کہ عصر حاضر میں مادیت اور روحانیت کا سب سے نمایاں اظہار کیمونزم اور عیسائیت کی صورت میں ہوا' لہٰذا کتاب کا ایک بڑا حصہ ان دونوں کے تقابل پر مشتمل ہے۔ کتاب کے عنوان میں اسی تہذیبی کشمکش کی طرف اشارا ملتا ہے۔

جناب بیگو وچ کا خیال ہے کہ سوشلزم اور عیسائیت میں سے کوئی بھی نظام حیات انسان کے لیے موزوں نہیں' کیونکہ انسان نہ محض مشین ہے کہ سوشلزم سے مطمئن ہو جائے اور نہ محض روح کہ عیسائیت کے مطابق کامیاب زندگی گزار سکے۔ انسان جسم اور روح کا مجموعہ ہے لہٰذا جب سوشلزم یا عیسائیت جیسے نظام ہائے حیات کو انسانوں پر نافذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو ان میں سے ہر ایک کو اپنی اصلی شکل میں تبدیلیاں کرنی پڑتی ہیں۔ سوشلزم کو آزادی' مساوات' حقوق انسانی' قومی جذبہ وغیرہ جیسے نعرے اپنانا پڑتے ہیں' جو اپنی اصل میں مذہبی نعرے ہیں۔ اسی طرح عیسائیت کو رنگ و بو کی دنیا کی طرف توجہ دینی پڑتی ہے۔ سوشلزم اور عیسائیت کی یہ "درگت" (ناکامی) ظاہر کرتی ہے کہ انسان کے لیے صحیح ضابطہ حیات وہی ہو سکتا ہے جو اپنی اصلی شکل میں جسم اور روح دونوں کے تقاضے پورے

کرے۔ کتاب کے آخری پانچ ابواب میں ثابت کیا گیا ہے کہ ایسا نظامِ حیات صرف اسلام ہے جس میں بشر رہتے ہوئے اور ترکِ دنیا کیے بغیر' روحانی ترقی اور اُخروی نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ ہر اسلامی عمل میں جسم اور روح دونوں حصہ لیتے ہیں۔ جیسے نماز میں تلاوت و تسبیح سے پہلے جسم کو صاف کرنا پڑتا ہے' یعنی وضو کرنا ہوتا ہے۔ عیسایت میں عبادت کے لیے جسمانی صفائی ضروری نہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب کی تمام تر خوبیوں کے باوجود اسے اپنے موضوع پر حرفِ آخر قرار دینے میں کئی موانع ہیں۔ مصنف نے سائنس کی ۲ + ۲ = ۴ جیسی خشک منطق اور میکانکی تصویر پیش کرنے کے بعد' یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جوہرِ انسانی (تخلیقی صلاحیت) کا اظہار صرف غیر سائنسی سرگرمیوں (خصوصاً" فنونِ لطیفہ) ہی میں ہوتا ہے۔ نتیجتاً" مصنف ہر طرح کے ادب اور مصوری وغیرہ کو انسانیت کی معراج اور انتہائی مقدس قرار دینے پر مجبور نظر آتے ہیں۔ سائنس کی اس خشک تصویر سے اکثر سائنس دان اتفاق نہیں کریں گے' جو تصور کرتے ہیں کہ سائنس بھی کسی حد تک تخلیقی عمل ہے' اور یہ کہ جیسے مختلف انسان مختلف ادب پیدا کرتے ہیں اسی طرح مختلف سائنس دان بھی کسی ایک مسئلہ کے بارے میں متعدد نظریے پیش کر سکتے ہیں۔ اگرچہ سائنس میں ہر نظریے کے پیش کار کو اپنے خیالات کی مثالیں اور دلائل دینا ہوتے ہیں۔

اس پہلو کو نظرانداز کر دینے کے باعث زیرِ تبصرہ کتاب کے مصنف ڈارون کے خیالات کو سائنس کی حتمی رائے قرار دیتے ہیں' مگر اس کے باوجود (انسان کے روحانی تجربات کے پیشِ نظر) اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ زندگی کے روحانی پہلو کی اہمیت نہ سمجھنے والے ایک عام شخص کے لیے ان کی دلیل کو موجودہ شکل میں جذب کرنا شاید مشکل ہو۔ وہ واضح الفاظ میں جاننا چاہے گا کہ "سائنس سے بھی بڑی دلیل" کونسی ہے اور کیوں ہے؟

سرمایہ دارانہ نظام کے مختلف پہلوؤں پر اس کتاب میں کئی جگہ تنقید کی گئی ہے۔ بایں ہمہ مصنف نے سرمایہ داری اور جمہوریت کی حیثیت اس طرح متعین نہیں کی جیسی سوشلزم اور عیسائیت کی۔ یہ واضح نہیں ہو سکا کہ مصنف سرمایہ داری کو آج کی مغربی دنیا میں عیسائیت کی عملی شکل سمجھتے ہیں یا کچھ اور؟ کتاب کے آخر میں وہ برطانوی اور امریکی معاشرے اور یورپ کی چند سیاسی پارٹیوں کے بعض پہلوؤں کی تعریف کرتے ہیں اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ "ایک غیر مسلم قوم ایمان لائے بغیر بھی کسی حد تک اسلامیت اختیار کر سکتی ہے۔" ممکن ہے

کچھ مدتوں کے لیے یہ بات قابل قبول نہ ہو۔کتاب کے شروع میں یہ وضاحت کردی گئی ہے کہ "یہ اسلام پر ایک جامع کتاب نہیں" نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کے مخصوص عقائد کے حق میں دلائل اس کتاب کے دائرہ بحث سے خارج ہیں۔

ایسے مشکل اور منطقی مباحث کی حامل اس کتاب کا ترجمہ کرنا آسان کام نہ تھا' مگر فاضل مترجم جناب ایوب منیر نے بڑے عمدہ انداز میں اس چیلنج سے عہدہ برا ہونے کی کوشش کی ہے۔ ان کا ترجمہ رواں اور محاوراتی ہے۔ البتہ کہیں کہیں ضرورت سے زیادہ "محاوراتی" ہو گیا ہے۔کتاب کے انگریزی متن میں موجود چند دلائل اردو ترجمے میں جگہ نہیں پا سکے۔ فنونِ لطیفہ پر ایک پورا باب (نمبر ۳) محذوف ہے۔ اس طرح بعض دیگر ابواب کے چند حصوں کا ترجمہ شامل نہیں کیا گیا۔ اگر اس کا سبب مترجم کی یہ رائے ہے کہ اردو دان طبقہ استدلالی انداز سے زیادہ مانوس نہیں تو یہ ناقابل قبول ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر اردو زبان منطق و فلسفہ سے کیوں کر مانوس ہو گی۔ ہمارے خیال میں اردو دان طبقے کو استدلالی انداز سے مانوس کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ ایسے مباحث آسان اور عمدہ اسلوب میں ان کے سامنے پیش کیے جائیں۔ چوں کہ سائنس و فلسفہ مترجم کا میدان نہیں ہے اس لیے بعض مشکل خیالات اور عبارات میں منطقی ربط قائم رکھنے میں کہیں کہیں عجز کی صورت نظر آتی ہے۔

اس سے قطع نظر یہ کتاب قارئین پر سوچ کی نئی راہیں کھولتی اور انھیں علم اور فکر کے نئے آفاق سے روشناس کراتی ہے اور مروجہ افکار و نظریات اور علوم و فنون کے بارے میں ایک اسلامی نقطۂ نظر کی تعمیر و تشکیل کرنے کی طرف ایک اہم قدم ہے۔کتاب پر قیمت درج نہیں' یہ کوتاہی افسوس ناک ہے۔

(ڈاکٹر بلال مسعود)

## THE ROLE OF JUDICIARY AND THE OBJECTIVES RESOLUTION

از سردار شیر عالم خان ایڈووکیٹ۔ ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز' مرکز ایف ر ۷ اسلام آباد۔ صفحات: ۱۱۲۔ قیمت ۵۰ روپے

پاکستان کا قیام مسلمانان برعظیم کے گہرے تاریخی شعور اور اسلامی تصورِ حیات کے لیے ان کی طویل جدوجہد کا ثمر ہے۔ تحریک پاکستان کے دوران میں بانی پاکستان اور مسلم لیگ

کے بہت سے دوسرے راہنماؤں نے بار ہا یہ اعلان کیا کہ حصولِ پاکستان کا مقصد اس خطۂ زمین کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانا ہے' مگر پاکستان بن گیا تو حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ سید مودودیؒ کو اسلامی دستور کے لیے عوامی سطح پر جدوجہد کا آغاز کرنا پڑا۔ دستور ساز اسمبلی کے ایوان میں علامہ شبیر احمد عثمانی رحمتہ اللہ علیہ کی رہنمائی اور لیاقت علی خان مرحوم کی قیادت میں سردار عبدالرب نشتر' ڈاکٹر عمر حیات ملک' ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی' چودھری نذیر احمد جیسے لوگوں نے پوری کوشش کی کہ اس نوزائیدہ مملکت کے نظریے اور عقیدے کا آئینی سطح پر اعلان کیا جائے۔ ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ کو منظور ہونے والی "قرار دادِ مقاصد" انھی مساعی کا نتیجہ تھی۔

"قرار داد مقاصد" کی منظوری کے بعد' وطن عزیز کی سیکولر قوتوں کو جمہوری انداز اپناتے ہوئے اسے تسلیم کر لینا چاہیے تھا' مگر ایسا نہیں ہوا' جس کے نتیجے میں ملک پہلی دستور ساز اسمبلی کی تحلیل' ۱۹۵۳ کی تحریکِ ختم نبوت' اور ۱۹۵۶ کے آئین کی پامالی جیسے افسوس ناک سانحوں سے دوچار ہوا۔ اس صورت حال میں قرار داد مقاصد کی حیثیت ایک نمایشی دستاویز بن کر رہ گئی تا آنکہ ۱۹۷۳ کے آئین میں آٹھویں ترمیم (آرٹیکل ۲' الف) کے ذریعے اس کا قرار واقعی مقام متعین کیا گیا' چنانچہ اب یہ قوتِ نافذہ کی حامل زندہ دستاویز بن گئی ہے اور مطلوب بھی یہی تھا۔

افسوس ہے کہ (شاید "روشن خیالی" اور مغرب سے مرعوبیت کے زیرِ اثر) سپریم کورٹ آف پاکستان کے جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ نے "قرار دادِ مقاصد" کی اس برتر آئینی حیثیت کو تسلیم کرنے سے صریحاً" انکار کر دیا۔ انھوں نے "حاکم خان کیس بنام حکومت پاکستان" ۱۹۹۲ میں "قرار دادِ مقاصد" کی' متذکرہ بالا دستوری فضیلت کے تصور کو مسترد کر دیا۔ اسلامی تصورِ عدل کے برعکس ہماری اعلیٰ عدالتیں اپنے فیصلوں پر سنجیدہ رائے زنی کو "توہین عدالت" کے زمرے میں لاتی ہیں' لیکن سچی بات یہ ہے کہ اعلیٰ عدالتوں کے اس "استحقاق" کا اطلاق قرآن و سنت' اسلامی شعائر اور متفقہ قومی مینڈیٹ کی تعبیر و تنقید کا حلیہ بگاڑنے پر نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ ہمارے بعض قانون دان یا وکلا جب شریعت کورٹ کو "نام نہاد عدالت" کہتے اور لکھتے ہیں تو ہمارے اعلیٰ عدالتی نظام کو اس میں "توہین عدالت" کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔۔۔۔؟

تبصرہ نگار کے خیال میں جسٹس محمد منیر نے تحریکِ ختم نبوت ۱۹۵۳ کی "انکوائری رپورٹ" میں

جس منفی عمل کا آغاز کیا تھا' وہی سوچ' بہ اندازِ دگر' جسٹس ڈاکٹر تسیم حسن شاہ صاحب کے متذکرہ فیصلے میں نظر آتی ہے۔ ہماری قابلِ احترام عدالتِ عظمٰی کے ان نامور افراد کے یہ فیصلے روح کے اعتبار سے ایک جیسی سیکولر سوچ کے حامل ہیں۔

جناب سردار شیر عالم ایڈووکیٹ نے "حاکم خان کیس" سے پیدا شدہ خطرے کی شدت کو بھانپتے ہوئے دینی حمیت پر بے حسی اور خاموشی کے اس ماحول میں کلمہ حق بلند کیا ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے غیر جذباتی مگر مضبوط اور تحقیقی استدلال میں خود مغربی اور امریکی اعلیٰ عدالتوں اور اسکالرز کے نظائر کے حوالے سے "حاکم خان کیس" میں پوشیدہ مغالطوں اور حدود سے تجاوز رویوں کا بھرپور محاکمہ کیا ہے۔ دستوری تاریخ' آئینی امور اور فنی مباحث کا یہ گلدستہ اپنے دامن میں دلیل اور اپیل کا جہانِ معانی سمیٹے ہوئے ہے۔ ایک اعتبار سے یہ پاکستان کی آئینی تاریخ اور اسلامی قانون کے حرکی پہلو کا مختصر مگر جامع تجزیہ بھی ہے۔ یہ مقالہ سردار شیر عالم ایڈووکیٹ کی پیشہ وارانہ دیانت' جراتِ اظہار اور ایمان کی پختگی کا مظہر ہے۔

پیش لفظ میں وفاقی شرعی عدالت کے سابق چیف جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن نے کتاب میں اٹھائے گئے نکات کی تائید کرتے ہوئے اس امر پر زور دیا ہے کہ مذکورہ مقدمے میں عدالت اصل نکتے سے ہٹ گئی تھی' اس لیے ضروری ہے کہ سپریم کورٹ اس مسئلے پر دوبارہ غور کرے۔

اس مقالے کا اردو ترجمہ چودھری محمد یوسف ایڈووکیٹ (۶۱۶ بی سیٹلائٹ ٹاؤن' گوجرانوالہ) نے "قرار دادِ مقاصد بنام سپریم کورٹ آف پاکستان" کے نام سے قدرے اختصار سے شائع کیا ہے۔ عامتہ الناس میں اس مسئلے کا شعور پیدا کرنے کے لیے ان کی یہ کوشش کامیاب اور لائقِ تحسین ہے۔ اشاعت میں مولانا زاہد الراشدی مدیر "الشریعہ" کی معاونت قابلِ داد و ثواب ہے۔ (سلیم منصور خالد)

**اسلام اور اکیسویں صدی کا چیلنج :** از اسرار عالم۔ ناشر: دین و دانش پبلی کیشنز دہلی۔ صفحات: ۱۱۴۔ قیمت: ۲۵ روپے

یہ کتاب اس یقین و اذعان کے ساتھ شائع کی گئی ہے کہ ۲۱ ویں صدی' اسلام کے غلبے اور اظہار کی صدی ہے۔ "پوری دنیا' مغربی تہذیب کے بادِ سموم سے نیم جان ہو کر

سرچشمۂ حیات کی تلاش میں سرگرداں ہے" اور "اب دنیا کے سامنے اسلام کے سوا' کوئی متبادل نظریۂ حیات نہیں ہے۔"

جناب مولف شکوہ کناں ہیں : "عصر حاضر میں بعض ملکوں کی تحریکات اسلامی میں تمسک بالکتاب والسنتہ کے مطلوبہ معیار کا لحاظ رکھنے کے تعلق سے کوتاہی ہو رہی ہے۔ اسی طرح عجلت پسندی اور بعض صورتوں میں معاصر طاغوتی افکار سے مغلوبیت بھی ہماری ملی کمزوریوں میں شامل ہے۔ اس کے باوجود' امت مسلمہ کو ۲۱ ویں صدی کے چیلنج کا مقابلہ کرنا ہے' مگر کس طرح؟--- "اس کا سیدھا' صاف اور واحد جواب یہ ہے کہ قرآن و سنت کے مطابق"--- اور یہ کہ امت شہدا علی الناس بن کر ہی اپنا رول اور فرض منصبی ادا کر سکتی ہے۔ یہی امت کا اصل وظیفہ ہے اور اس کے لیے ہر خطے میں اقامتِ دین ضروری ہے۔ مصنف کے نزدیک اقامت دین کا مفہوم ہے : دین حنیف کی مخلصانہ پیروی اور زندگی کے انفرادی و اجتماعی تمام پہلوؤں میں اس کا نفاذ و اجرا' تاکہ "فرد کا ارتقا اور معاشرے کی تعمیر اس کے مطابق ہو۔ یہاں تک کہ زمین پر خلافتِ عامہ قائم ہو جائے۔" مصنف کہتے ہیں کہ جب تک افراد اور اجتماعیات اس کام کو کماحقہ نہیں کر پائیں گے' نتیجہ خاطر خواہ بر آمد نہیں ہو گا۔

مصنف کا ذہن بہت واضح اور صاف ہے۔ ان کے نزدیک "قرآن و سنت ہی معیارِ خیر و شر ہیں۔" وہ قرآن و حدیث کا وسیع اور گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے مغربی فکر اور تہذیب کا بھی عمدہ تعارف کرایا ہے اور اس تعارف و تجزیے کو مناسب اور ضروری حوالوں اور اقتباسات سے بخوبی لیس کر دیا ہے۔ ان کا یہ خیال بہت حقیقت پسندانہ ہے کہ : "دنیا تہذیبی' ثقافتی اور اخلاقی طور پر آج زیادہ غلام ہو گئی ہے۔ انارکی پیدا ہوئی نہیں ہے' بلکہ پیدا کی گئی ہے۔ دنیا کے سیاسی اور معاشی نظام کو براہ راست اور بالواسطہ مخصوص سمت میں چلایا جا رہا ہے' اور دنیا میں سیاسی اور معاشی اقتدار کی کلیت قائم کی جا رہی ہے۔ اس کلیت کے قیام میں سب سے متحرک عنصر ذرائع ابلاغ عامہ (Mass Media) ہے۔ اور شیطانی قوتیں' انسانیت کو گمراہی میں مبتلا رکھنے کے لیے ذرائع ابلاغ کا استعمال پوری شدت سے کر رہی ہیں"۔ آخر میں' اسرار عالم صاحب نے مختلف علوم کی اصطلاحات کی وضاحت بھی کر دی ہے۔ حاصلِ مطالعہ یہ کہ ۲۱ ویں صدی کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے' اول : قرآن و سنت اور جدید علوم' فکر اور سائنس کے گہرے مطالعے اور تفہیم کی ضرورت ہے'

دوم : اقامت دین کے لیے نہایت حکمت و تدبر اور بصیرت کے ساتھ --- صحیح سمت میں فعال جدوجہد ناگزیر ہے۔

(رفیع الدین ہاشمی)

**اردو میں ادبِ اطفال' ایک جائزہ :** از پروفیسر اکبر رحمانی۔ ناشر : ایجوکیشنل اکادمی' اسلام پورہ' جلگاؤں' بھارت۔ صفحات ۱۱۶۔ قیمت ۳۵ روپے۔

پروفیسر اکبر رحمانی' جلگاؤں سے ایک تعلیمی جریدہ "آموزگار" شائع کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل جریدہ مذکورہ کے "ادبِ اطفال نمبر" میں مختلف اہل قلم نے ادبِ اطفال کے مسائل' فروغ و ترویج اور اس راہ کی مشکلات پر بحث کی تھی۔ یہی خاص نمبر' زیرِ نظر کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ لکھنے والوں میں ظ' انصاری' میرزا ادیب اور جگن ناتھ آزاد جیسے کہنہ مشق اور نامور اہلِ قلم شامل ہیں۔ ادبِ اطفال کے نقادوں اور ادیبوں کو اس مجموعے میں مفید نکات ملیں گے۔ اس ضمن میں سب سے توجہ طلب بات تو یہ ہے کہ بچوں کی اخلاقی اور تہذیبی تربیت کے لیے جامع' حکیمانہ اور سائنٹی فک طریق پر منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔

(رفیع الدین ہاشمی)

**تعلیم الفرائض یعنی تقسیم میراث :** از پروفیسر عبد الرحیم ارشد۔ ملنے کا پتا : اسٹینڈرڈ بک ہاؤس' اردو بازار' لاہور۔ صفحات ۳۲۔ قیمت ۱۲ روپے۔

تقسیم میراث پر اردو زبان میں اپنی نوعیت کا منفرد کتابچہ جس میں تمام ضروری معلومات' اختصار سے دی گئی ہیں۔ ہر باب کے آخر میں سوالات بھی قائم کیے گئے ہیں۔

---

## وضاحت

۱۔ ترجمان القرآن میں ترجیحاً دینی اور علمی کتابوں پر تبصرے شائع کیے جاتے ہیں۔

۲۔ تبصرے کے لیے کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں۔

۳۔ تبصرے کے لیے مطبوعات براہِ راست: مدیر ترجمان القرآن منصورہ' لاہور ۵۴۵۷۰ کو بھیجی جائیں۔

# مدیر کے نام

نصر اللہ' کراچی

سید مودودیؒ کی کہانی / ان کی اپنی زبانی آپ نے خوب پیش کی۔ تحریک میں بعد کے دور میں آنے والوں کے لیے اس میں یقیناً" بہت نشانیاں ہیں!

محمد شمعی' حیدر آباد

۶۰ سال گزر گئے۔۔۔ لیکن سید مودودی کی اس دور کی تحریروں کی جھلکیوں سے محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اپنے خیر خواہوں کے ساتھ رویہ میں کوئی خاص فرق نہیں آیا ہے۔

محمد اجمل' سکھر

اصولی طور پر یہ درست سہی کہ مسلمانوں میں عالم کوئی منصب نہیں (رسائل و مسائل ستمبر ۹۴) اور نہ علما ہمارے اعمال کے ذمہ دار ہیں' لیکن عملاً تو ہر ایک نے کسی نہ کسی کا دامن پکڑا ہوا ہے۔ شاید اس کی نفسیاتی توجیہ یہ ہو کہ اس طرح اپنے آپ کو بَری الذمہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ علما کی زائد ذمہ داری سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مقصود احمد' راولپنڈی

موجودہ دور میں مسلمان ملکوں میں حکومت کے ملازمین کسی بھی ضابطہ اور قاعدہ کے علی الرغم محض اپنی وفاداری کے عذر پر' شہریوں خصوصاً" سیاسی مخالفین کے ساتھ ظلم و تشدد کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ مصر' شام اور دوسرے ملکوں میں تحریک اسلامی پر کیا کچھ نہیں گزر گیا۔ کیا یہ عمّال' حجاج کے انجام سے سبق نہیں لے سکتے! (وفا شعاری کے دو نادر نمونے' ستمبر ۱۹۹۴)

محمد سعید اللہ' پشاور

مغرب کو چاہیے کہ وہ مسلمان ملکوں میں مغرب کی پروردہ کلاسوں کی کارکردگی کا انصاف سے جائزہ لے۔۔۔ تو اسے مسلمانوں کے غیظ و غضب کی وجہ معلوم ہو جائے گی اور خود اپنے گریبان میں بھی جھانک لے کہ مسلمانوں کے ساتھ اس کا کیا رویہ ہے۔

طوبیٰ مستور، کراچی

یقین نہیں آتا--- ترجمان القرآن کے ابتدائی دور میں سیّد مودودیؒ ان مراحل سے گزرے۔ (اشارات، ستمبر ۹۴)

حکیم سید صابر علی، جلالپور جٹاں، گجرات

ذاتی طور پر موجودہ حالات میں آپ کی یہ تجویز کہ امریکا پر سنجیدہ اور مدلل تنقید ہو، اس کی دو عملی سیاست کی نقاب کشائی بھی، انتہائی قابل قدر تصور کرتا ہوں۔ لیکن آپ کے اشارات پڑھنے کے بعد امریکا کے بارے میں جو رد عمل پیدا ہوتا ہے وہ اس تجویز کے برعکس ہے۔ بوسنیا اور کشمیر میں امریکی پالیسی ہم کیسے بھلا سکتے ہیں۔ امریکا اگر پاکستان اور مسلم دشمنی کا نیو ورلڈ آرڈر جاری کرنا چاہتا ہے تو اس پر چاند ماری اور دشنام طرازی سب درست ہے، اور ے مفاہمت نہ سکھا جبر ناروا سے مجھے! کے مصداق ہمیں ممولے کو شہباز سے لڑانے کی پالیسی جاری رکھنا پڑے گی۔ روس جیسی طاغوتی قوت اگر ٹوٹ گئی ہے تو امریکا کی شیطانی قوت بھی بیسویں صدی ختم ہونے سے پہلے ٹوٹے گی (ان شاء اللہ) لسانی، علاقائی اور فرقہ واریت کے جو مسائل اس نے مشرق کے لیے اور اسلامی دنیا کے لیے پیدا کیے ہیں وہی سانپ بن کر اس کے جسم کو ڈسیں گے۔

ڈاکٹر محمد ایوب خان، لاہور

روس کی مشکلات کے بعد امریکا کھلے طور پر مسلمانوں کو تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ ہر مسلمان اپنے طور پر عسکری تربیت حاصل کرے۔ اب جو جنگ ہوگی، ان شاء اللہ مسلمان غالب ہوں گے۔

جلال الدین عمری، علی گڑھ، بھارت

ماہ نامہ "ترجمان القرآن" پابندی سے مل رہا ہے۔ اب وہ اپنی نئی شکل میں زیادہ پُرکشش اور مندرجات کے لحاظ سے زیادہ وقیع ہو گیا ہے۔ آپ کے سنجیدہ فکری مباحث سے استفادہ کا موقع ملتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے اور اپنے دین کی خدمت کی مزید توفیق دے، اور ہمت و توانائی عطا فرمائے۔

محمد ریاض بلوچ، گوادر

سوڈان میں حسن ترابی (اگست ۹۴) کی بہت سی اصلاحات غیر صحیح لگتی ہیں۔ ان کی بعد میں اصلاح کی جا سکتی ہے۔ دعاگو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں سوڈان کے طرز پر پاکستان میں بھی انقلاب لانے کی توفیق عطا فرمائے۔

Backliner

REGD. NO. L 5340

Back

PHONE : 7234014
7236665

MONTHLY TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE